REGD. L. NO.7243 Phone 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اپریل 984

اس پرچہ میں

(۱) شاہنشاہیت
آمریت ۔ مغربی جمہوریت
سب خلافِ اسلام ہیں ۔

(۲) پہلا پاکستانی کون تھا ؟

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ-۲ لاہور

قیمت فی پرچہ 4 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

بدل اشتراک سالانہ		قیمت فی پرچہ
پاکستان /۴۸ روپے غیر ممالک /۹۸ روپے	ٹیلیفون: ۸۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔بی گلبرگ ۲ لاہور	۴ چار روپے
جلد ۳۷	اپریل ۱۹۸۴ء	شمارہ ۴

فہرست

۱۔	لمعات (غلامی اور محکومی)	۲
۲۔	صدرِ مملکت کی اہم تقریریں	۹
۳۔	صدرِ مملکت کی خدمت میں!	۱۲
۴۔	یادگار محفلیں	۱۴
۵۔	درسِ قرآن کریم کے اعلانات	۱۵
۶۔	باب المراسلات (۱) کالعدم جماعت اسلامی اور انتخابات	۱۷
	(۲) اتحاد بین المسلمین کا عملی مظاہرہ	۱۹
۷۔	حقائق و عبر: (۱) ناموسِ پیغمبر کے محافظ (۲) اتحادِ ملت کی واحد بنیاد	۲۱-۲۳
	(۳) اونٹ کا بچہ	۲۴
۸۔	پہلا پاکستانی کون تھا؟ (یومِ پاکستان پر پرویز صاحب کا خطاب)	۲۵
۹۔	بادشاہت، آمریت، مغربی جمہوریت، سب غیر اسلامی ہیں (محترم پرویز صاحب)	۴۱

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر شیخ عبدالمجید۔ مقام اشاعت ۲۵۔بی گلبرگ ۲ لاہور۔ مطبوعہ اشرف پرنٹنگ پریس ۹۔ایبک روڈ لاہور

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

بیادِ اقبالؒ

لمعات

"تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنانا شروع کیا۔ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا"

{حضرت عمرؓ ۔۔۔ بنام حضرت عمرو ابن عاصؓ}

حضرت عمرؓ نے اس ایک فقرے میں تکریم و تذلیلِ انسانیت کا سارا مسئلہ واضح کر دیا۔ ہر انسانی بچہ آزاد (فلہٰذا مستوجبِ شرفِ انسانیت) پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس کی اپنی نوع ہی کے افراد اسے غلام اور محکوم بنا لیتے ہیں۔ (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں) یہ "شرف" حضرتِ انسان ہی کو حاصل ہے کہ یہ اپنی نوع کے افراد کا غلام بن جاتا ہے۔ حیوانات میں ایسا نہیں ہوتا۔

ص ۱۵۵

آدم از بے بصری بندگیِ آدم کرد !	گوہرے داشت ولے نذرِ قباد و جم کرد	(پیامِ مشرق)
یعنی از خوئے غلامی ز سگاں خوار تر است	من ندیدم کہ سگے پیشِ سگے سر خم کرد !	(")

جب ہم غلام (یا غلامی) کے الفاظ بولتے ہیں تو ہمارا ذہن عہدِ قدیم کے ایک خاص طبقہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ عصرِ حاضر کا مہذب انسان بڑے فخر سے کہتا ہے کہ ہم نے غلامی (SLAVERY) کو معدوم کر دیا ہے۔ لیکن اس نے درحقیقت جو کیا ہے وہ اتنا ہی ہے کہ اس نے اس مرض کو ایک خاص طبقہ سے نکال کر عالمگیر انسانیت میں پھیلا دیا ہے۔ آج دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا انسان ہو جو اپنے آپ کو آزاد محسوس کرتا ہو! اگر کوئی کسی دوسرے فرد کا غلام نہیں تو خود اپنے آپ کا غلام ہے ۔۔۔۔ اور یہ غلامی کی اور بھی زیادہ شدید شکل ہے۔

سوال یہ ہے کہ غلامی یا محکومی کہتے کسے ہیں! عام الفاظ میں کہہ دیا جائے گا کہ کسی دوسرے کے کام کرنے کو غلامی یا محکومی کہتے ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے اور متمدن معاشرہ میں مختلف لوگ، مختلف کام کرتے ہیں ۔۔۔۔ ڈاکٹر ہم درزی کے بچے کا علاج کرتا ہے۔ درزی ڈاکٹر کے کپڑے سیتا ہے۔ قرآنِ کریم اسے تعاون کہہ کر پکارتا ہے۔ (یعنی ایک دوسرے کی مدد کرنا) اور اچھے کاموں میں تعاون کی نہ صرف تاکید کرتا ہے بلکہ حکم دیتا ہے۔ یہ غلامی یا محکومی نہیں۔

آپ اپنے ملازم سے کہتے ہیں کہ باہر صحن میں تین فٹ گہرا گڑھا کھود دو۔ ملازم آپ سے پوچھ نہیں سکتا کہ گڑھا کیوں کھودا جائے گا۔ اس کا مقصد کیا ہے۔ اس کی غایت کیا ہے؟ اگر وہ پوچھے بھی تو آپ اسے یہ کچھ بتانے کے لئے مکلف نہیں۔ مقصد آپ کا ہے اور آپ کے ذہن میں ہے۔ وہ آپ کے مقصد کے بروئے کار لانے کا ذریعہ (INSTRUMENT) ہے، اور بس۔

آپ اپنے لڑکے سے کہتے ہیں کہ بیٹا! میں باہر جا رہا ہوں۔ میں نے ملازم سے گڑھا کھودنے کے لئے کہا ہے۔ تم اپنی نگہداشت میں گڑھا کھدوا لینا! وہ آپ سے پوچھے گا کہ ابا جان! گڑھا کیوں کھدوایا جا رہا ہے۔ اس کا مقصد کیا ہے، اس کی غایت کیا۔ اگر آپ (ایک مستبد نہیں بلکہ) مشفق باپ ہیں تو آپ اسے سب کچھ بتاتے ہیں۔ وہ کسی بات پر اعتراض کرتا ہے تو آپ اس کا جواب دیتے ہیں۔ آپ اسے دلائل سے اس کام کی افادیت اور اہمیت کا قائل کراتے ہیں۔ جب وہ یوں قائل (یعنی آپ سے متفق) ہو جاتا ہے تو پھر آپ کی ہدایت کے مطابق گڑھے کی نگہداشت کرتا ہے۔

آپ کے حکم کی تعمیل، ملازم نے بھی کی ہے اور آپ کے بیٹے نے بھی۔ لیکن دونوں کی تعمیل میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ملازم، اپنی کسی مجبوری کی وجہ سے (جس کے لئے اس نے آپ کی ملازمت اختیار کر رکھی ہے) آپ کے حکم کی تعمیل کرتا ہے۔ آپ کا بیٹا کسی مجبوری کی وجہ سے ایسا نہیں کرتا۔ جب وہ آپ کے دلائل سے قائل ہو کر، اس اسکیم سے متفق ہو گیا تو وہ آپ کے حکم کی تعمیل نہیں کرتا۔ وہ خود اپنے فیصلے پر عمل کرتا ہے۔ یعنی اب اس کے باپ کا حکم اس کا اپنا فیصلہ بن جاتا ہے۔ اور اپنے فیصلے کی تعمیل، نہ محکومی ہے، نہ غلامی۔

لہٰذا جس حکم کو ایسے دلائل و براہین کی تائید کے ساتھ پیش کیا جائے جن سے آپ کا قلب و دماغ مطمئن ہو جائے، تو اس کی تعمیل کسی غیر کے حکم کی اطاعت نہیں۔ خود اپنے فیصلے کی پیروی ہوگی۔ اسے آزادی کہا جائے گا۔ اور جس حکم کو نہ اس طرح دیا جائے نہ اس کی اس طرح تعمیل کی جائے، وہ غلامی اور محکومی ہوگی۔ اس سے انسان، سطحِ انسانیت سے گر کر درجۂ حیوانیت پر پہنچ جاتا ہے۔ سورۃ یٰسین میں ہے: اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ۝ وَذَلَّلْنٰهَا ..... (۳۶/۷۱-۷۲)۔ کیا یہ لوگ اس پر غور نہیں کرتے کہ ہم نے مویشیوں کو خود پیدا کیا اور پھر (انسانوں کو) ان کا مالک بنا دیا۔ یہ ان سے "ذلت آمیز" کام لیتے ہیں۔ اس میں دو نکات غور طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ انسان حیوانات کا تو مالک ہو سکتا ہے، اپنے جیسے کسی انسان کا نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ جس انداز سے حیوانات سے کام لیا جاتا ہے، وہ انداز انسانوں کے لئے وجہ تذلیل ہے۔ حیوانات کے حق میں اسے اس لئے روا رکھا گیا ہے کہ انہیں تکریم و تذلیل کا احساس نہیں۔ انسانوں کو اس درجہ پر لے آنا انہیں انسان سے حیوان بنا دیتا ہے۔ اسی کو غلامی یا محکومی کہتے ہیں۔

اس غلامی اور محکومی کو عصرِ حاضر کے "مہذب" انسان نے نہیں مٹایا۔ اسے چودہ سو سال پہلے صحرائے عرب کے ایک امّی (صلعم) نے مٹایا تھا اور اس طرح (قرآن کے الفاظ میں) ان اغلال و سلاسل کو

کاٹ کر پھینک دیا تھا جس میں نوعِ انسان جکڑی ہوئی چلی آرہی تھی، اور ان استخواں شکن سلوں کو اس کے سر سے اتار پھینکا تھا جن کے بوجھ کے نیچے وہ دبی چلی آرہی تھی۔ (7/157)۔ یعنی اس نے انسان کو انسان کی غلامی اور محکومی سے چھڑا دیا تھا۔

اُس دَور کو اس نے یَوۡمُ الدِّیۡن کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی وہ دَور جس میں الدّین کا نظام قائم ہوا تھا۔ اس کی خصوصیتِ کبریٰ یہ تھی کہ لَا تَمۡلِكُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَيۡـًٔا...... (82/19) جس میں کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر "حقِ ملکیت" نہیں رکھتا تھا۔ کوئی کسی کا نہ غلام تھا، نہ محکوم۔ نہ محتاج تھا نہ دبیل!

کہا جائے گا کہ اس نے انسانوں کو انسانوں کی غلامی اور محکومی سے چھڑا دیا لیکن انہیں احکامِ خداوندی کا پابند تو بنا دیا! کیا یہ بھی محکومی نہیں؟ بے شک اس نے احکامِ خداوندی کی دعوت دی، لیکن اس پر بہت کم غور کیا گیا ہے کہ اس نے ان احکام کو کس انداز سے پیش کیا؟ اس نے ان احکام کو محکم دلائل اور قاطع براہین کے ساتھ پیش کیا۔ نوعِ انسان کو دعوت دی کہ وہ ان دلائل کی روشنی میں ان احکام پر غور و فکر کرے، اور اگر وہ ان سے کامل طور پر مطمئن ہو تو انہیں اختیار کرے۔ ورنہ انہیں مسترد کر دے۔ اس نے، اس ضابطۂ احکام کو پکارا ہی برہان کہہ کر ہے۔ ارشاد ہے:-

يَاۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَكُمۡ بُرۡهَانٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكُمۡ نُوۡرًا مُّبِيۡنًا (4/175)

اے نوعِ انسان! تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے برہان آگئی ہے۔ یعنی ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب بھیجی ہے جو خود بھی روشن ہے اور ہر شے کو روشن کر دیتی ہے۔

اس لئے کہا کہ رسولوں کو بھیجا ہی اس لئے جاتا تھا کہ لوگوں کو یہ کہنے کی گنجائش نہ رہے کہ ہمیں بات سمجھائی نہیں گئی تھی؛ رُسُلًا مُّبَشِّرِيۡنَ وَمُنۡذِرِيۡنَ لِئَلَّا يَكُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ ۢ بَعۡدَ الرُّسُلِ...... (4/165) یہ رسول، لوگوں کو واضح طور پر بتاتے تھے کہ ان احکامِ خداوندی کی اطاعت سے تمہیں کس قدر فائدہ ہوگا۔ اور ان کی خلاف ورزی سے تم کس قدر خسارے میں رہو گے۔ اس طرح خدا کی طرف سے اتمامِ حجّت ہو جاتی تھی۔ "وہ ایسے دلائل پیش کرتے تھے جو سیدھے دل میں اُتر جاتے تھے۔ فَلِلّٰهِ الۡحُجَّةُ الۡبَالِغَةُ...... (6/150)۔ آپ قرآنِ کریم میں دیکھئے۔ ہر حکم اور ہدایت کے بعد یہ لکھا ملے گا ـــــ لَعَلَّكُمۡ یا لَعَلَّهُمۡ ـــــ یعنی اس حکم پر عمل کرو گے، تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا۔

اس لئے کہا کہ خدا نے کتاب کے ساتھ حکمت بھی نازل کی ہے۔ کتاب کے معنی ہیں احکام و قوانین۔ اور حکمت سے مراد ہے ان احکام کی غرض و غایت۔ ان کا مقصود و مطلوب۔ ان کی حکمت (RATIONALE) یعنی خدا نے ایک مستبد حاکم کی طرح صرف احکام ہی نازل نہیں کئے۔ ایک مشفق طبیب اور معلّم کی طرح یہ بھی بتایا ہے کہ یہ احکام کیوں نازل کئے گئے ہیں۔ ان کے مطابق چلنے سے تمہیں کیا حاصل ہوگا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا کہ تم ان احکامات اور ان سے متعلقہ دلائل و براہین پر غور و فکر کرو۔

علم وبصیرت کی روشنی میں انہیں سمجھنے کی کوشش کرو۔ تفکر و تدبر سے کام لو۔ اس کے بعد اگر تم ان کی افادیت اور اہمیت کے متعلق کامل طور پر مطمئن ہو جاؤ تو انہیں تسلیم کر لو۔ اگر مطمئن نہ ہو تو انہیں مسترد کر دو۔ تم پر کسی قسم کا جبر نہیں۔ استبداد نہیں۔ جو لوگ اس ضمن میں بحث میں الجھتے تھے قرآن انہیں ڈانٹتا نہیں تھا۔ ان سے کہتا یہ تھا کہ دھاندلی مت مچاؤ۔ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (۲۷/۶۴) اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو اس کی تائید میں دلائل و براہین پیش کرو۔ ہم اپنے دعوے کو بدلائل پیش کرتے ہیں۔ تم اس کی مخالفت کرتے ہو تو دلائل کی رو سے ایسا کرو۔ ہم اپنے احکام کو کسی سے زبردستی نہیں منواتے۔ لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ...... (۲/۲۵۶) غلط اور صحیح دونوں راستے تمہارے سامنے ہیں۔ ان میں سے جو نسا راستہ تمہارا جی چاہے اختیار کر لو۔ ہم تمہارے اختیار اور ارادے کو سلب نہیں کرنا چاہتے۔ فیصلہ تمہارا اپنا ہوگا۔ جب رسول اللہ اس پر کبیدہ خاطر ہوتے کہ یہ لوگ تباہی کا راستہ کیوں اختیار کرتے ہیں تو ارشاد باری تعالیٰ ہوتا: أَفَأَنتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (۱۰/۹۹) کیا تو انہیں صحیح راستہ اختیار کرنے پر مجبور کرے گا۔ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَن فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا ...... (۱۰/۹۹) اگر انہیں جبراً صحیح راستے پر چلانا مقصود ہوتا تو ہم انہیں مویشیوں کی طرح پیدا ہی اس طرح کرتے کہ یہ غلط راستہ اختیار ہی نہ کر سکتے۔ لیکن وہ تو غلامی اور محکومی ہوتی۔ آزادی نہ ہوتی۔

حتیٰ کہ خود ان لوگوں سے بھی کہہ دیا کہ اگر تم نے اس دعوت کو دل و دماغ کی رضامندی کے بغیر (کسی وجہ سے) تسلیم کر لیا، تو ہم تمہارا شمار ماننے والوں میں کریں گے ہی نہیں۔ "ماننے والے" تو وہ ہوتے ہیں کہ وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا (۲۵/۷۳) جب ان کے سامنے ہماری آیات پیش کی جاتی ہیں تو وہ انہیں بھی بہرے اور اندھے بن کر تسلیم نہیں کرتے۔ واضح رہے کہ ماننا یا مسترد کرنا پورے کے پورے قرآن کا ہوگا۔ اگر قرآن کا کوئی ایک حکم بھی ایسا ہے جس پر آپ کا قلب مطمئن نہیں تو آپ کا شمار اس کتاب کے ماننے والوں میں نہیں ہوگا۔

ظاہر ہے کہ جب خدا خود اپنے احکام بھی بلا دلیل و برہان، زبردستی نہیں منواتا، تو وہ اس کی اجازت کب دے سکتا ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان سے اپنے احکام بہ جور و اکراہ منوائے۔ یہ غلامی ہوگی اور وجہ تذلیل انسانیت! اس لئے اس نے واضح طور پر کہہ دیا کہ کسی انسان کو حق حکومت حاصل نہیں۔ (یعنی) پہلی بات تو یہ ہے کہ اطاعت صرف احکام خداوندی کی کرائی جائے گی۔ اور یہ اطاعت بہ دلائل و براہین ان سے کرائی جائے گی جو اس پر بدل مطمئن ہوں۔ انہی کو جماعتِ مومنین کہا جائے گا۔

اس طرح احکام خداوندی کی اطاعت کرنے والوں سے مزید تاکیداً کہا کہ ان احکام کو نافذ کرنے کے طور طریق باہمی مشورہ سے طے کرو۔ مشورہ میں مختلف دلائل سامنے آتے ہیں اور امورِ متعلقہ کے مختلف پہلوؤں پر غور و خوض کیا جاتا ہے۔ مشورہ کا حکم جماعتِ مومنین ہی کو نہیں دیا۔ خود نبی اکرم کو بھی اس میں شامل کیا گیا۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم نے انسانوں کو جو آزادی عطا فرمائی اس کا ملخّص یہ تھا کہ
(۱) کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسانوں پر اپنا حکم چلائے۔
(۲) حکم صرف خدا کا چلے گا۔ لیکن وہ بھی ان لوگوں پر جو بدلائل و شواہد ان احکام کی افادیت کے بدل قائل ہوں۔ اس میں کسی قسم کا جبر و اکراہ نہیں ہوگا۔
(۳) اور ان احکام پر عمل درآمد، باہمی مشورہ سے ہوگا۔

قرآن کریم نے انسان کو ایسی آزادی عطا کی۔ اور صدرِ اوّل میں ایسا نظام قائم کیا گیا جس میں اس آزادی پہ ذرا سی بھی آنچ نہ آنے پائی۔

اس کے بعد قرآن اور اس کا نظام تو پس پردہ چلا گیا اور مسلمان قوم باقی رہ گئی۔ اس قوم نے غلامی کی ایک ایک شق کو دوبارہ زندہ کیا اور آزادی کو اس انداز سے سلب کیا جس نے فرعون اور ہامان اور قارون کی نہ صرف یاد تازہ کرادی بلکہ ان کی ستم کوشیوں اور ایذا رسانیوں کی داستانوں کو ماند کر دیا۔ اور یہ سب کچھ اسلام کے نام پر کیا۔ فرعونی ملوکیت ایسی کہ اگر کسی نے ایسا پوچھنے کی بھی جرأت کر لی کہ اس حکمِ سلطانی کا مقصد کیا ہے، تو کھال کھنچوا دی۔ ہامانی مذہبی پیشوائیت ایسی کہ اگر کسی نے انسانوں کے وضع کردہ قوانینِ شریعت کے متعلق کہہ دیا کہ وہ منشاءِ خداوندی کے مطابق نہیں، تو اسے مرتد قرار دے کر حوالۂ دار و رسن کر دیا۔ قارونی سرمایہ داری ایسی کہ ہر محنت کش ڈرا اور سہما ہوا کہ اگر مالک نے کام سے نکال دیا تو بچوں کو روٹی کہاں سے کھلاؤں گا۔ ہزار برس سے یہ بدنصیب قوم خوف و حزن کے اسی انسانیت سوز ماحول میں حیوانوں سے بھی بدتر زندگی گذار رہی ہے۔ ان حالات میں شرف و تکریمِ آدمیت آزادی و حریت کا نام لینا تو ایک طرف، اس کا دل میں خیال تک لانا بھی جرم قرار پا جاتا ہے۔

اس شوریدہ بخت قوم کی غلامی کی جگر سوزی کا یہی احساس تھا جس پر دیدۂ بینائے قوم، خون کے آنسو رو تا رہا۔ اقبالؒ نے غلامی اور محکومی کی انسانیت سوزی کے متعلق اتنا کچھ لکھا ہے کہ وہ ایک دفتر میں بھی نہیں سما سکتا۔ یہاں ہم اس کے صرف دو چار، جہنم زار مقامات پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔ جہنّم زار اس لئے کہ قرآن کریم نے جہنّم کے داروغہ کو پکارا ہی "مالک" کہہ کر ہے۔ (۴۳/۷۷) جس معاشرہ میں انسانوں پر انسانوں کی حکومت ہو، وہ جہنّم نہیں تو اور کیا حیثیت ہوگا۔

——— (۰) ———

ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری کے ہزار سالہ نظام سے اس قوم کی جو حالت ہو چکی ہے، اس کے متعلق وہ "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں کہتے ہیں ؎

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ ابلیسی نظام　　پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں غلام
ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجود　　ان کی فطرت کا تقاضا ہے نمازِ بے قیام!
آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں!　　ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام
یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج　　صوفی و مُلّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام

(ارمغانِ حجاز ص ۱۵)

وہ کہتے ہیں کہ ایسی قوم کے افراد کی ذلّت آمیز زندگی تو ایک طرف، اس کی میّت کو لحد میں اتارا جائے تو قبر کی مٹی چیخ اٹھتی ہے ؎

آہ ظالم! تو جہاں میں بندۂ محکوم تھا؛ ــــ میں نہ سمجھی تھی کہ ہے کیوں خاک میری سوزناک!
تیری میّت سے مری تاریکیاں تاریک تر ــــ تیری میّت سے زمیں کا پردۂ ناموس چاک!
الحذر، محکوم کی میّت سے سو بار الحذر ــــ اے سرافیل! اے خدائے کائنات! اے جانِ پاک! (ص ۲۳۷)

اور اس کے بعد وہ نظم جس کا عنوان ہے ــــ دوزخی کی مناجات۔

اس دیرِ کہن میں ہیں غرض مند پجاری ــــ رنجیدہ بتوں سے ہوں تو کرتے ہیں خدا یاد!
پوجا بھی ہے بے سود، نمازیں بھی ہیں بے سود ــــ قسمت ہے غریبوں کی وہی نالہ و فریاد!
ہیں گرچہ بلندی میں عمارات فلک بوس ــــ ہر شہر حقیقت میں ہے ویرانۂ آباد! (ص ۲۳۸)

ضربِ کلیم میں آزاد اور محکوم کا تقابل ان الفاظ میں کرایا گیا ہے: ؎

آزاد کی اک آن ہے، محکوم کا اک سال ــــ کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات
آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت ــــ محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات!
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منوّر ــــ محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات!
محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا! ــــ ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات (ص ۷۷)

ضربِ کلیم ہی میں "نفسیاتِ غلامی" کے عنوان سے دو نظمیں ہیں۔ ایک میں کہتے ہیں: ؎

سخت باریک ہیں امراضِ اُمم کے اسباب ــــ کھول کر کہیے تو کرتا ہے بیاں کوتاہی
دینِ شیری میں غلاموں کے امام اور شیوخ ــــ دیکھتے ہیں فقط اک فلسفۂ روباہی!
ہو اگر قوّتِ فرعون کی در پردہ مرید ــــ قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللّٰہی! (ص ۱۶۱)

دوسری نظم کا موضوع بھی اس سے ملتا جلتا ہے۔ فرماتے ہیں: ؎

شاعر بھی ہیں پیدا، علماء، حکماء بھی! ــــ خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ!
مقصد ہے ان اللہ کے بندوں کا مگر ایک ــــ ہر ایک ہے گو شرحِ معانی میں یگانہ
بہتر ہے کہ شیروں کو سکھا دیں رمِ آہو ــــ باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ!
کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضامند ــــ تاویلِ مسائل کو بناتے ہیں بہانہ! (ص ۱۴۲)

قوموں کی تقدیریں ان کی ابھرنے والی نسل کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ ان میں کا ہر فرد، ملّت کے مقدّر کا ستارہ ہوتا ہے۔ قوم کو ابدی غلامی پر مطمئن رکھنے کا بہترین طریق یہ ہے کہ اس کی نوجوان نسل کو تعلیم اس انداز سے دی جائے کہ وہ ابھرے ہی غلام بن کر۔ ضربِ کلیم میں "نصیحت" کے عنوان سے یہ نسخہ عام کیا گیا ہے کہ ؎

اک فردِ فرنگی نے کہا اپنے پسر سے[1] ــــ منظر وہ طلب کر کہ تری آنکھ نہ ہو سیر!

---

[1] بات تو یہ فردِ فرنگی نے تقسیمِ ہند سے پہلے کہی تھی لیکن ہم پر یہ آج بھی اسی طرح صادق آتی ہے کیونکہ ہمارا نظامِ تعلیم وہی ہے۔

بیچارے کے حق میں ہے یہی سب سے بڑا ظلم　　بَرّے پہ اگر فاش کریں قاعدۂ شیر!
سینے میں رہے رازِ ملوکانہ تو بہتر!　　کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر
تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو　　ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر!
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب　　سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر! (ص ۱۵۶)

ص ۱۶۲ پر ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے —— غلاموں کی نماز۔ (ترکی وفد ہلالِ احمر، لاہور میں)۔ کہتے ہیں ؎

کہا مجاہدِ ترکی نے مجھ سے بعدِ نماز　　طویل سجدہ ہیں کیوں اس قدر تمہارے امام؟
وہ سادہ مردِ مجاہد، وہ مومنِ آزاد　　خبر نہ تھی اسے کیا چیز ہے نمازِ غلام؟
ہزار کام ہیں مردانِ حُر کو دنیا میں　　انہیں کے ذوقِ عمل سے ہیں اُمتوں کے نظام
بدن غلام کا سوزِ عمل سے ہے محروم　　کہ ہے مرورِ غلاموں کے روز و شب پہ حرام
طویل سجدہ اگر ہیں تو کیا تعجب ہے　　وَرائے سجدہ غریبوں کو اور ہے کیا کام!
خدا نصیب کرے ہند کے اماموں کو!
وہ سجدہ جس میں ہے ملت کی زندگی کا پیام

(۰)

زبورِ عجم کے آخری باب کا تو عنوان ہی "بندگی نامہ" ہے یعنی غلامی اور محکومی۔ جی تو چاہتا تھا کہ وہ سارے کا سارا باب یہاں نقل کر دیا جائے لیکن عدم گنجائش اس کی مانع ہے۔ اس لئے اس کے صرف چند اشعار درج ذیل کئے جاتے ہیں ؎

از غلامی دل بمیرد در بدن　　از غلامی روح گردد بار تن
از غلامی بزمِ ملت فرد فرد　　این و آں، با این و آں اندر نبرد
آں یکے اندر سجود، این در قیام　　کاروبارش چوں صلوٰۃ بے امام
در فتد ہر فرد با فردے دگر　　ہر زماں ہر فرد را دردے دگر
آبروئے زندگی در باختہ　　چوں خراں با کاہ و جو در ساختہ (ص ۲۴۸)

ذرا آگے چل کر کہا ہے:-

دین و دانش را غلام ارزاں دہد　　تا بدن را زندہ دارد، جاں دہد
گرچہ بر لب ہائے او نامِ خداست　　قبلۂ او طاقتِ فرمانرواست
ایں صنم تا سجدہ اش کردی خداست　　چوں یکے اندر قیام آئی فناست
آں خدا، نانے دہد، جانے دہد　　ایں خدا جانے برد، نانے دہد

محکومی صرف ایک خدا کی جائز ہے جس سے دنیا بھر کی سرفرازیاں نصیب ہو جاتی ہیں۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات (نوشتہ ۱۹۸۱ء)

صدر مملکت کی اہم تقاریر

اخبارات کے مندرجات کی زندگی، عام طور پر، دو ایک دن سے زیادہ نہیں ہوتی لیکن ان میں بعض خبریں، تقاریر اور بیانات ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی اہمیت اس سے زیادہ ہوتی ہے۔ طلوع اسلام اس قسم کے مندرجات کو اپنے صفحات میں محفوظ رکھ لیتا ہے اور تجربہ نے بتایا ہے کہ مستقبل میں یہ بڑے مفید ثابت ہوتے ہیں۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو طلوع اسلام کے فائل اہم تاریخی دستاویزات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پچھلے دنوں صدر مملکت، جنرل ضیاء الحق صاحب نے دو تین ایسی تقاریر کی ہیں جن کا محفوظ رکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

(۱)

انہوں نے سندھ زکوٰۃ و عشر کنونشن میں جو تقریر کی وہ روزنامہ جنگ (لاہور) کی ۱۱ مارچ کی اشاعت میں یوں شائع ہوئی:۔

"صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے اعلان کیا ہے کہ وہ اسلام کے نام پر حکومت قائم کر کے رہیں گے، مملکت پاکستان میں حاکمیت صرف اللہ کی ہوگی، حاکمیت نہ کسی فرد کی ہو سکتی ہے اور نہ کسی پارٹی کی۔ وہ آج حاجی کیمپ میں دوسرے سندھ زکوٰۃ و عشر کنونشن سے خطاب کر رہے تھے، انہوں نے کہا کہ انتخابات اور اسلام میں کوئی تضاد نہیں ہے لیکن پاکستان میں مغربیت نہیں چلے گی، ہمیں مسئلہ یہ درپیش ہے کہ ہم اسلامی نظام حکومت لائیں یا مغربی، ۳۵ سال سے ہمارے یہاں اسلام کا نام لیا جا رہا ہے لیکن اسلام کے لئے کوئی کام نہیں کیا گیا، کیا ہم آئندہ حکومت سے یہ توقع کر سکتے ہیں؟ انہوں نے سوال کیا کہ ہم نے پاکستان کیوں بنایا تھا؟ اسلام کے لئے بنایا تھا مگر اب ہم مغربیت کی طرف جا رہے ہیں، انہوں نے کہا کہ میں اس ملک میں اسلام کے نام پر حکومت قائم کر کے رہوں گا جس کی ایک جھلک مولانا ظفر احمد انصاری کی رپورٹ میں نظر آتی ہے۔ اس حکومت نے اس سلسلے میں یہ اعلان نہیں کیا کہ اسے یہ رپورٹ پوری قبول ہے یا آدھی۔ انہوں نے انتخابات کا نام لینے والوں کے بارے میں کہا کہ اسلام کا نام ضرور لیا جائے اسلام اور انتخابات میں تضاد نہیں ہے لیکن جو شخص عہدے کا طالب ہے، یہ ضروری نہیں کہ عہدے کا حقدار بھی ہو۔

انہوں نے رسول اکرمؐ کی ایک حدیث کا حوالہ دیا جس میں فرمایا گیا ہے کہ تم میں سے جو شخص

عہدہ مانگنے آئے اس پر کبھی یقین نہ کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ ہم اس بات کے قائل ہیں کہ ایسے حضرات جو عہدے قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں مگر عہدے کے اہل ہیں ہم ان پر عہدے ٹھونسیں گے، اسی طرح سارے آدمی سامنے آئیں گے، انہوں نے کہا کہ اگر میں بھی آپ کے سامنے آؤں اور کہوں کہ مجھے ووٹ دیجیئے تو آپ میرے منہ پر تھوک دیں، آج آپ اپنے دل میں یہ عہد کر کے اٹھیں کہ حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہوگی، ہم حکومت اس شخص اور ان ارکان کے سپرد کرنا چاہتے ہیں جو اسلام کے اصولوں پر کاربند ہوں۔

صدر نے کہا کہ مجھ سے کہا جاتا ہے کہ کیا آپ نئی پارٹی بنا رہے ہیں یا آپ کا جانشین کون ہوگا، آپ کے ساتھی کون ہیں۔ ان کے لئے میرا جواب یہ ہے کہ ملک میں ۳۵ ہزار زکوٰۃ کمیٹیاں ہیں، ہر کمیٹی میں سات افراد ہیں، یہ سب میری مدد کے لئے تیار ہیں، کسی شخص کے پاس جب دس لاکھ افراد اسلام کے نام پر کٹنے مرنے کو تیار ہوں تو اسے پارٹی بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ انہوں نے کہا کہ زکوٰۃ کے نظام اور حدود کے نفاذ سے اچھے نتائج حاصل ہو رہے ہیں، اگرچہ بہت سی توقعات پوری نہیں ہوئی ہیں، زکوٰۃ کی رقم ۳۳۳ کروڑ روپے وصول ہوئی ہے لیکن گداگروں کی فوج ابھی موجود ہے، بیواؤں کی بڑی تعداد امداد سے محروم ہے، میں تو فوجی حکومت کے ذریعے آپ کی خدمت کر رہا ہوں، کل حکومت میں تبدیلی آئے گی تو کیا وہی طریقہ کار ہوگا جس کے تحت ۳۵ سال سے سیاست ہو رہی ہے، اس وقت جس طرح عاملین زکوٰۃ یہاں بیٹھے ہیں کیا پھر اس طرح کے لوگ مل سکیں گے؟ انہوں نے دعوت دی کہ آپ اسلامی ریاست کا نقشہ دیکھئے جو مدینہ منورہ میں قائم تھی، رسول اللہؐ نے ہجرت کیوں کی، اس میں کیا بہتری تھی، مدینہ منورہ میں پہلی اسلامی حکومت کے سربراہ رسول اللہؐ تھے، اس وقت کا اسلامی معاشرہ ہمارے سامنے ہے، اس وقت کا نقشہ دیکھتے ہوئے کیا ہم یہ جائز ہے کہ ہم ایک طرف اپنے آپ کو اسلامی مملکت بھی کہیں اور دوسری طرف یہ بھی کہیں کہ پاکستان میں انتخابات ہونے چاہئیں، انہوں نے کہا کہ ضرور ہونے چاہئیں لیکن ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ رائج نظام اسلامی ہو یا مغربی! انہوں نے کہا کہ پاکستان میں مغربی جمہوریت کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، ہمیں "مساوات محمدیؐ" کے قیام کے لئے کام کرنا ہوگا۔"

صدر مملکت نے پشاور کے جلسہ عام میں جو تقریر فرمائی (اور جو روزنامہ جنگ کی ۱۳ مارچ کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی) بڑی اہم تھی لیکن وہ بڑی مفصل تھی جس کے لئے طلوعِ اسلام کی حالیہ اشاعت میں گنجائش نہیں نکل سکتی۔ اسے ہم کسی دوسری اشاعت پر اٹھا رکھتے ہیں اور ان کی وہ تقریر شائع کرتے ہیں جو انہوں نے صوبائی کونسل (پشاور) کے ارکان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمائی تھی، اور جو روزنامہ جنگ مورخہ ۱۴ مارچ سنہ ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی تھی۔

"صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے آج یہاں گورنر ہاؤس میں صوبائی کونسل کے ارکان سے خطاب کرتے ہوئے کہا مستقبل میں سیاست اور حکومت کے ڈھانچہ میں اسلام کو بالادستی اور سربلندی حاصل ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ اسلام میں ایسے کسی ایوان کا تصور نہیں ہے جو حزب اقتدار اور حزب اختلاف میں بٹا ہوا ہو۔ اسلام میں صرف حزب اللہ ہے جس کے ارکان اس وقت حکمرانوں کا محاسبہ کریں گے جب وہ اسلامی اقدار سے انحراف کریں گے۔ انہوں نے کہا اسلام میں سیاسی جماعتوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں اور انہیں اقتدار کی رسہ کشی میں ملوث نہیں ہونا چاہیئے نہ ہی اسلام میں پارلیمانی یا صدارتی نظام حکومت کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اسلام نے صرف بعض رہنما اصول متعین کئے ہیں جن میں سے ایک اصول یہ ہے کہ جو لوگ اقتدار کے خواہشمند ہیں انہیں اقتدار نہ دیا جائے۔ انہوں نے کہا جماعتی اور غیر جماعتی بنیادوں پر انتخابات کی بجائے اسلامی جمہوریت پر زور دینے کا واحد مقصد یہ ہے کہ افراد کے ذاتی کردار کو فوقیت دی جائے۔ صدر نے کہا اسلام میں اقتدار حاصل کرنے والوں پر یہ لازم قرار دیا ہے، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے کام کریں اور اسلام میں حاکمیت اللہ تعالیٰ ہی کی ہے۔ صدر نے کہا ١٩٧٩ء اور ١٩٨٣ء میں بلدیاتی انتخابات کرانے کے بعد ہمارا اگلا نصب العین صوبائی اسمبلیوں اور قومی اسمبلی کے انتخابات کرانا ہے۔

انہوں نے کہا بلدیاتی انتخابات کا تجربہ کامیاب رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سنہ ١٩٨٣ء کے انتخابات بے حد کامیاب رہے ہیں کیونکہ ووٹروں اور امیدواروں کی تعداد ١٩٧٩ء کے مقابلے میں زیادہ رہی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بلدیاتی نظام کی جڑیں قائم ہو گئی ہیں اور عوام میں یہ نظام مقبول ہوا ہے۔

صدر نے اپنے اس خیال کا پھر اظہار کیا کہ منتخب ہونے والی مجلس شوریٰ یا پارلیمنٹ میں نامزد لوگ بھی ہوں تاکہ ملک علماء اور مختلف شعبوں کے ماہرین سے بھی استفادہ کر سکے جو انتخابات کے چکروں میں نہیں پڑ سکتے۔ انہوں نے کہا یہ کوئی نئی بات نہیں ہوگی کیونکہ برطانوی پارلیمنٹ کا سارا ایوان بالا (دارالامراء) موروثی ہے اور اس کے باوجود جمہوری نظام کا ایک حصہ ہے انہوں نے کہا یہ میری ذاتی رائے ہے اس سلسلے میں ابھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا گیا۔

خریدار صاحبان متوجہ ہوں

(۱) بسا اوقات ادارہ ہذا کے نام جو منی آرڈر موصول ہوتے ہیں ان کے کوپنز (COUPONS) پر خریدار کا مکمل پتہ نہیں لکھا ہوا ہوتا۔ اس کا خاص خیال رکھا جائے تاکہ تعمیل میں بلا وجہ تاخیر نہ ہو۔

(۲) پرچہ نہ ملنے کی اطلاع خریدار ماہ رواں کی پندرہ تاریخ تک بھیج دیں۔ اس صورت میں ہی پرچہ دوبارہ ارسال کیا جائیگا

(۳) جواب طلب امور کے لئے جوابی لفافہ ارسال کریں۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

صدرِ مملکتِ پاکستان کی خدمت میں

صدرِ محترم! آپ نے اپنی تقاریر میں اکثر کہا ہے کہ حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے اور آپ کا مقصد پاکستان میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو قائم کرنا ہے۔ یہ جذبات بڑے مستحسن اور یہ مقصد بڑا مبارک ہے۔ سارا اسلام سمٹ کر اس کے اندر آجاتا ہے اور شرف و تکریم انسانیت کی ضمانت وہی حکومت دے سکتی ہے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا تو غیر مرئی، غیر محسوس ہستی ہے جو انسان کے وہم و گمان سے بھی ماوراء ہے۔ وہ نہ کسی کے سامنے آتا ہے۔ نہ کسی کو براہِ راست کوئی حکم دیتا ہے۔ نہ دنیا میں تختِ حکومت پر بیٹھتا ہے۔ تو ایسے خدا کی حکومت قائم کس طرح ہوتی ہے؟ یہ معلوم کس طرح ہو سکتا ہے کہ اس کی حکومت قائم ہو گئی ہے۔ اگر یہ متعیّن طور پر واضح نہ ہو، تو نہ ان الفاظ کا مطلب سمجھ میں آسکتا ہے۔ نہ ان سے کوئی نتیجہ مرتب ہو سکتا۔ اس کا تجربہ ہم پہلے بھی کر چکے ہیں "حکومتِ خداوندی" کی طرح ؛ اسلامی مملکت۔ اسلامی نظام۔ اسلامی حکومت۔ اسلامی قوانین۔ اسلامی شریعت۔ اسلامی معاشرہ جیسے مقدس الفاظ ایک عرصہ سے فضا میں گونج رہے ہیں۔ کبھی ان الفاظ کی اثر انگیزی کا یہ عالم تھا کہ یہ قلب و نگاہ میں انقلاب برپا کر دیتے تھے اور معاشرہ رشکِ فردوس بن جاتا تھا۔ یہ اس لئے کہ اس وقت ان الفاظ کا مفہوم متعیّن تھا۔ اب انہیں محض نعرے کا استعمال کیا جاتا ہے، جس سے، نہ صرف یہ کہ ان کا کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوتا بلکہ جس کا جی چاہے قوم کو جل دے کر ان سے ناجائز فائدہ اٹھا لیتا ہے۔ جو کچھ کسی حسبِ منشاء ہوتا ہے وہ اسے اسلامی کر دیتا ہے۔ دوسرے اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ اس کا فیصلہ کوئی بھی نہیں کر سکتا کہ کون صحیح کہتا ہے اور کون غلط۔ یہ تمام اختلافات اور افتراقات اسی لئے پیدا ہوتے ہیں کہ ان اصطلاحات کا مفہوم متعیّن نہیں کیا گیا۔ یہ بتایا نہیں گیا کہ کسی بات کے اسلامی ہونے کی اتھارٹی کیا ہے؟

قائدِ اعظمؒ نے جب حکومتِ خداوندی یا اسلامی مملکت کے الفاظ استعمال کئے تھے تو انہوں نے ان کا متعیّن مفہوم واضح کرنا ضروری سمجھا تھا تاکہ کسی قسم کی غلط فہمی یا

ابہام کی گنجائش نہ رہے۔ انہوں نے فرمایا تھا۔

اسلامی مملکت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن حکیم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں، قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔ (حیدر آباد دکن کا انٹرویو)

یہ مفہوم خود قرآن کریم کا متعین کردہ ہے، اس سے یہ بات ہر ایک کی سمجھ میں آگئی کہ خدا کی حکومت کس طرح قائم کی جا سکتی ہے۔ پھر کسی کو ان سے نہ کچھ مزید پوچھنے کی ضرورت رہی۔ نہ کسی قسم کے اختلاف کی گنجائش۔

آپ بھی یہی کہیئے کہ آپ کا مقصد پاکستان میں ایسی حکومت قائم کرنا ہے جس میں تمام فیصلے خدا کی کتاب کے مطابق ہوں گے۔ اس سے تمام ابہامات ختم اور اختلافات حل ہو جائیں گے۔ قرآن کا پیمانہ ہر ایک کے ہاتھ میں ہوگا جس سے ماپا اور پرکھا جائیگا کہ خدا کی حکومت قائم ہوئی ہے یا نہیں، اور کونسی چیز اسلامی ہے اور کونسی غیر اسلامی۔ حضرت عمرؓ نے جب کہا تھا۔ حسبنا کتاب اللہ۔ تو اس سے ان کی یہی مراد تھی۔

ان بنیادی اصطلاحات کو مبہم رکھ کر ہم صدیوں سے، اپنی خوش فہمیوں اور خود فریبیوں کی غلام گردشوں میں حیران و سرگرداں پھر رہے ہیں، اور اسلام کے نام پر جو کچھ کیا جاتا ہے، نہ صرف یہ کہ رائیگاں جاتا ہے، بلکہ امت کے لئے تخریب کا موجب بن جاتا ہے۔ انہیں مبہم رکھنا، ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی سازش تھی ان کا متعین مفہوم سامنے لانے سے ان دونوں کا وجود ختم ہو جاتا تھا۔ انہیں اپنا وجود باقی رکھنا مطلوب تھا خواہ اس سے اسلام، گورِ غریباں کا چراغِ مردہ، اور امت راکھ کا ڈھیر بن کر بھی کیوں نہ رہ جائے۔

جو مردِ مومن ان اصطلاحات کا متعین اور عملی مفہوم سامنے لانے کی جرأت کرے گا وہی ملت کا محسن ہوگا اور اسی کے ہاتھوں اسلام کو فروغ حاصل ہوگا۔ جب تک یہ نہیں ہوگا، شاعری اور پڑکاری تو بہت ہو گی۔ دین کا احیاء نہیں ہوگا۔

یادگار محفلیں

پرویز صاحب کا درس قرآن کریم ، ہر جمعۃ المبارک کی صبح ، ادارہ کے سبزہ زار میں' باہمہ شستگی و شائستگی وجوشادابی قلب ونظر ہوتا ہے۔ اس کی کشش دن بدن بڑھتی جارہی ہے۔ للہ الحمد کہ نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ اس میں خصوصیت سے دلچسپی لے رہا ہے آج کل انتیسویں پارہ کا نصف آخر زیر تدریس ہے۔

ہفتہ واری درس کے علاوہ ، سال بھر میں اہم تقاریب پر مخصوص درس ہوتے ہیں چنانچہ ۲۳ مارچ کو یوم پاکستان کی تقریب اس کے شایان شان طریق سے منائی جائیگی۔ اس میں درس کا عنوان ہوگا ، "پہلا پاکستانی"۔ درس کا متن اسی اشاعت میں وجہ فروغ دیدہ ہے۔ ۲۱۔اپریل کو علامہ اقبالؒ کی یاد میں خصوصی محفل منعقد ہوگی۔ وہ خطاب آئندہ اشاعت میں زیب دہ اوراق ہوگا۔

پرویز صاحب کے درس اور خصوصی خطابات، کیسٹوں میں ریکارڈ ہو کر، اندرون اور بیرون پاکستان نشید افروز ہوتے ہیں۔

ادارہ کے علاوہ، بعض بزمیں اپنے اپنے ہاں بھی، خصوصی محفلیں منعقد کرتی ہیں۔ چنانچہ یوم پاکستان کے سلسلہ میں' بزم گجرات ، محترم ڈاکٹر محمد اکرم مرزا کی رہائش گاہ پر "مفکر قرآن ، پرویز صاحب کے ساتھ ایک شام" منانے کا اہتمام کر رہی ہے۔ گجرات اور گوجرانوالہ کی بزمیں التزاماً ایسی شامیں مناتی رہتی ہیں۔ یہ سب قرآن حکیم کی شمیم جانفزا کے عام کرنے کے ذرائع ہیں۔

حکایت قدِ آں یارِ دل نواز کنم　　　　بایں بہانہ مگر عمر خود دراز کنم

اسلامی معاشرت

پرویز صاحب کی اس عام فہم کتاب میں زندگی کے روزمرہ کے امور کے متعلق قرآنی احکام ایسے سلیس اور دلکش انداز میں دیئے گئے ہیں کہ اس سے بچے اور کم تعلیم یافتہ لوگ بڑی آسانی سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس کے یکے بعد دیگرے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

قیمت -/۶ روپے علاوہ محصول ڈاک

محترم پرویز صاحب کا ہفتہ وار درسِ قرآن کریم

محترم پرویز صاحب کے اس درس نے عالمگیر شہرت حاصل کر لی ہے۔ مرکزی درسگاہ تو ادارہ طلوعِ اسلام (B/۲۵-گلبرگ ۲) ہے جہاں یہ درس (ٹائیلی) ہر جمعہ کی صبح ۹ بجے شروع ہوتا ہے لیکن اندرون پاکستان اور بیرونی ممالک میں اسے ٹیپس (TAPES) کے ذریعے عام کیا جاتا ہے۔ حسب ذیل مقامات پر یہ (V-C-R) کے ذریعے نشر ہوتا ہے۔

کراچی: ہر جمعہ ۹½ بجے صبح دارالزہرہ بالائی منزل بالمقابل شاپ نمبر ۳ سرحد روڈ (کراچی صدر)

گجرات: ہر جمعرات تین بجے سہ پہر رہائش گاہ ڈاکٹر محمد اکرم مرزا صاحب جناح کالونی (گجرات) ٹیلیفون نمبر ۳۲۶۳۰ – ۳۲۷۳۰

اوسلو: (ناروے) ہر اتوار شام ۵ بجے بمقام:
JINNAH HALL, KEYSERS GATE-I OSLO-I
زیرِ انتظام زاہد صفدر صاحب ٹیلیفون نمبر 366988—674040

فریڈرکسٹاد: (ناروے) ہر ماہ کا پہلا اور تیسرا اتوار شام ۴ بجے بمقام:
ARNE SVENDSENS-GATE-4, 1600 FREDRIKSTAD,
NORWAY TEL: (032) 10287/22802

لندن: (یوکے) ہر ماہ کے آخری اتوار ۲ بجے بعد دوپہر بمقام
47 HURLEY-ROAD GREEN FORD
MIDDLE SEX TEL: 01-578-5631

برمنگھم: (انگلینڈ) ہر ماہ کا پہلا اتوار ۲ بجے بعد دوپہر
227/229 ALUM ROCK ROAD 38 - 3BH
(BIRINGHAM)

ٹورنٹو (کینیڈا): ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے صبح 335 DRIFT WOOD
AVE: #311, DOWNS VIEW, TORNTO (ONT)
M3N-2P3, TEL: (416) 661-2827

ملتان: ہر جمعہ ۹ بجے صبح دفتر میسرز شاہ سنز بیرون پاک گیٹ۔ فون نمبر (۳۱۰۴۱)

اور ذیل کے مقامات پر عام (TAPES) کے ذریعے

نام بزمِ طلوعِ اسلام	دن اور وقت	مقام اور درس کے کوائف
لاہور	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	۲۵-بی گلبرگ ۲ انڈ ویلیس سٹیشن فون نمبر ۸۸۰۸۰۰
لندن (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۲½ بجے بعد دوپہر	76, PARK ROAD, ILFORD, TELPHONE No. 553 — 1896
پشاور چھاؤنی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	رہائش گاہ آغا محمد یونس صاحب۔ رفیق بین صدر (بالمقابل VIP MAINGATE PESHAWAR STADIUM) باڑہ روڈ فون: ۷۲۹۵۹
پشاور	جمعہ ۹ بجے صبح	شیریں محل B-3 یونیورسٹی ٹاؤن
مردان	جمعہ ۱۰ بجے صبح	عبد اللطیف۔ محمود علی صاحب۔ اتفاق بلڈنگ نواب علی روڈ۔

نام بزم طلوع اسلام	دن اور وقت	مقام درس کے کوائف
راولپنڈی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	ج-۱۶۶ لیاقت روڈ
لیہ	جمعہ بعد نماز جمعہ	شبیر مکینیکل انجینئرنگ ورکس شہید روڈ لیہ
سرگودھا	جمعہ ۳ بجے سہ پہر	چوک واٹر سپلائی، مکان نمبر ۴۔ نظامی منزل
فیصل آباد	جمعہ ½۳ بجے سہ پہر	حیات سرجری کلینک، ۲۳/C پیپلز کالونی ۱ (فون نمبر ۴۲۸۵۵)
ہنگو	جمعہ ½۵ بجے شام	رہائش گاہ محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ (فون نمبر ۶۷)
پنجکسی تحصیل کبیر والہ (ملتان)	جمعہ ۳ بجے سہ پہر	مطب حکیم احمدالدین صاحب (نمائندہ بزم)
بہاول پور	جمعہ ۸ بجے صبح	عثمانی حیوانی شفاخانہ، غنی پورہ، باہتمام (ڈاکٹر ہومیو) محمد اعظم خاں صاحب
کوئٹہ	باقاعدہ ہفتہ وار	رابطہ کے لئے: ریڈیو اینڈ الیکٹرک سنٹر، ترغی روڈ، باہتمام غلام صابر صاحب
گوجرانوالہ	جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم، ملحق رہائش گاہ: چودھری مقبول شوکت صاحب گل روڈ (رسول لائن)
گجرات	جمعہ بعد نماز جمعہ اور اتوار ۴ بجے سہ پہر	۱/۱۲۰۔ بی۔ جمبیر روڈ۔ باہتمام شیخ قدرت اللہ صاحب ایڈووکیٹ
جلالپور جٹاں	جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم طلوع اسلام (بانانا کلاں)
ایبٹ آباد	(۱) جمعہ ۴ بجے سہ پہر	رہائش گاہ: صلاح الدین صاحب۔ واقع 234-K-L کہیاں (ایبٹ آباد)
"	(۲) اتوار ۴ بجے سہ پہر	رہائش گاہ غلام مصطفےٰ اعوان صاحب K-356 کیج گراؤنڈ (ایبٹ آباد)

سکوت و سکون کے ساتھ استفادہ کے خواہشمند حضرات کے لئے شرکت کی دعوت ہے

باب المراسلات

انتخابات اور (کالعدم) جماعت اسلامی

سوال :۔ آج کل (کالعدم) جماعت اسلامی کے ذمہ دار ارکان، بالعموم میاں طفیل محمد صاحب وغیرہ انتخابات کے پیچھے اس طرح پڑے ہوئے ہیں گویا یہ اقامتِ دین کے ایوان کے مرکزی ستون ہیں۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو مودودی صاحب (مرحوم) نے اسلام کی رُو سے انتخابات میں حصہ لینے کو ناجائز قرار دیا تھا۔ کیا یہ حضرات انہیں محض اپنا سیاسی لیڈر ہی سمجھتے تھے یا دینی معاملات میں بھی انہیں کچھ اہمیت دیتے ہیں؟

جواب :۔ آپ کا حافظہ یقیناً غلطی نہیں کرتا۔ مودودی صاحب (مرحوم) نے انتخابات کی شدت سے مخالفت کی تھی۔ انہوں نے ترجمان القرآن کی اکتوبر ۱۹۵۰ء کی اشاعت میں اس موضوع پر کتاب و سنت کی روشنی میں بحث کرنے کے بعد لکھا تھا۔

> اب ہم کو اس امر میں کوئی شک باقی نہیں رہا ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی اور قومی سیاست کو جن چیزوں نے سب سے بڑھ کر گندا کیا ہے ان میں سے ایک یہ امیدواری اور پارٹی ٹکٹ کا طریقہ ہے۔ اسی بناء پر جماعت اسلامی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس ناپاک طریق انتخاب کی جڑ کاٹ دی جائے۔ یہ جماعت نہ اپنے پارٹی ٹکٹ پر آدمی کھڑے کرے گی نہ اپنے ارکان کو آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہونے کی اجازت دے گی۔ نہ کسی ایسے شخص کی تائید کرے گی جو خود امیدوار ہو اور اپنے لئے آپ ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کرے، خواہ انفرادی طور پر یا کسی پارٹی کے ٹکٹ پر۔ یہی نہیں بلکہ جماعت اپنی انتخابی جدوجہد میں خاص طور پر یہ بات عوام الناس کے ذہن نشین کرے گی کہ امیدواری کا اٹھنا اور اپنے حق میں ووٹ مانگنا آدمی کے غیر صالح اور نااہل ہونے کی پہلی اور کھلی ہوئی علامت ہے۔ ایسا آدمی جب کبھی اور جہاں کہیں سامنے آئے لوگوں کو فوراً سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ ایک خطرناک شخص ہے۔ اس کو ووٹ دینا اپنے حق میں کانٹے بونا ہے۔ ص ۱۳-۱۲

جو لوگ کہتے ہیں کہ وہ اسلام کی خاطر انتخابات میں حصہ لینا ضروری سمجھتے ہیں، ان کے متعلق انہوں نے

کہا تھا۔

موجودہ زمانہ میں اس گھناؤنی حقیقت کو بہت سے خوشنما الفاظ کے پردوں میں چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے، مثلاً کہا جاتا ہے کہ ہم ملک اور قوم کی بھلائی کے لئے کام کرنا چاہتے ہیں، ہم اس لئے اٹھ رہے ہیں کہ اگر ہم نہ اٹھیں گے تو بڑے اور نالائق لوگ منتخب ہو جائیں گے۔ ہم اصلاح اور ترقی کا ایک پروگرام رکھتے ہیں اور قوم سے اس لئے ووٹ مانگتے ہیں کہ اگر وہ اسے پسند کرے تو اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے ہمیں منتخب کرے ——— اور قوم آخر خود کس طرح کام کے آدمی چھانٹ سکتی ہے جب کہ کام کا ارادہ اور خواہش رکھنے والے لوگ خود آگے بڑھ کر اپنے آپ کو اور اپنے اپنے پروگراموں کو اس کے سامنے پیش نہ کریں، ایسی ہی اور بہت سی دوسری باتیں یہ ثابت کرنے کے لئے پیش کی جاتی ہیں کہ ...... امیدواری محض لالچ ہی کی بناء پر نہیں بلکہ بے غرضانہ اور مخلصانہ خدمت کی نیت سے بھی ہو سکتی ہے، لیکن تمام حیلوں اور دلیلوں کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ جس خدمت کے ساتھ خطرات، نقصانات اور تکالیف وابستہ ہوں اس کے لئے اپنے آپ کو پیش کرنا تو بلاشبہ ایک سچے جذبۂ خدمت کی علامت ہو سکتا ہے۔ مگر جہاں خدمت اور دولت وحکومت باہم ملی جلی ہوں وہاں اپنے آپ کو خود پیش کرنے میں اخلاص کے امکانات بہت کم اور حرص وطمع کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ (صٹ)

یہ تھے اس "ناپاک طریقِ انتخاب" کے متعلق مودودی صاحبؒ مرحوم کے خیالات جس کی "جڑ کاٹنے کے لئے" اٹھے تھے۔

انہوں نے ۱۵ جون ۱۹۵۰ء کو جماعت اسلامی کے مرکزی دفتر میں ایک پریس کانفرنس میں، اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ کیا آپ کسی دوسری پارٹی کے صالح نمائندے کی انتخابات میں حمایت کریں گے، فرمایا کہ موجودہ طریقوں پر پارٹی ٹکٹ پر کسی امیدوار کا کھڑے ہونا خود نااہلیت ...... (DISQUALIFICATION) کا کھلا ہوا ثبوت ہے، کیونکہ جو شخص امیدوار ہو وہ صالح ہو ہی نہیں سکتا۔

(مولانا مودودی (مرحوم) کی تقاریر حصہ دوم ص۴۹ طبع اول ستمبر ۱۹۶۷ء)

ان کے اس مؤقف کے خلاف یہ اعتراض کیا گیا کہ اگر کسی شخص کا کسی منصب کے لئے بطور امیدوار کھڑے ہونا خلافِ اسلام ہے تو حضرت علیؓ کے متعلق کیا کہا جائے گا، جو منصب خلافت کے لئے بطور امیدوار کھڑے ہوئے تھے۔ اس کے جواب میں انہوں نے لمبی چوڑی بحث کے بعد کہا:

آخری فیصلہ کن بات اس مسئلہ میں یہ ہے کہ اگر صحابہ کرامؓ یا بزرگانِ سلف میں سے کسی کا عمل ایک طرف ہو اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے صاف صاف ارشادات دوسری

طرف تو ہمارے لئے یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ خدا اور رسول کے فرمان کو چھوڑ کر کسی بزرگ کے عمل کو اپنے لئے قانونِ زندگی قرار دیں۔ جس کا جو عمل بھی فرمانِ خدا اور رسول سے مختلف ہو وہ ایک لغزش ہے نہ کہ حجت۔ ان بزرگوں کی خوبیاں اور خدمات تو اتنی زیادہ تھیں کہ ان کی لغزشیں معاف ہو جائیں گی۔ مگر ہم سے زیادہ بدقسمت کون ہوگا اگر ہم اپنے گناہوں کے ساتھ اگلے پچھلے بزرگوں کی لغزشیں بھی چن چن کر اپنی زندگی میں جمع کر لیں۔

(ترجمان القرآن۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء ص ۲۳)

یہ تھا مودودی صاحب کا عقیدہ انتخابات کے متعلق رہا۔ باقی رہا یہ کہ میاں طفیل محمد صاحب مودودی صاحب (مرحوم) کو کیا سمجھتے تھے۔ تو اس کے متعلق انہوں نے فرمایا تھا:۔

مولانا مودودی (مرحوم) اس زمانے میں اسلام کی ایک مانی ہوئی ہستی تھے اور اسلام کے مسئلہ میں سند تھے۔ اور سند ہیں۔

(قاصد کشمیر نمبر بحوالہ ماہنامہ الفرقان۔ مئی ۱۹۵۵ء)

آپ کے دل میں شاید یہ سوال پیدا ہو کہ اس کے باوجود یہ حضرات انتخابات کو کس طرح (نہ صرف) جائز سمجھتے ہیں بلکہ انہیں اس قدر اہمیت دیتے ہیں؟ تو اس کا جواب واضح ہے۔ اگلے دنوں کسی نے کہا تھا کہ مودودی (مرحوم) نے پارٹی سازی کو ناجائز قرار دیا تھا۔ تو میاں صاحب نے فرمایا تھا کہ انہوں نے خود اپنی پارٹی بھی تو بنائی تھی۔ لہٰذا یہ نہ دیکھئے کہ انہوں نے کیا کہا تھا۔ یہ دیکھئے کہ انہوں نے کیا کیا تھا؟ ان کا قول بھی اسلام ہے۔ فعل بھی اسلام، خواہ وہ ایک دوسرے سے متضاد کیوں نہ ہوں! یہی معاملہ انتخابات کا ہے۔ انہوں نے انہیں "ناپاک" کہا لیکن اس کے بعد عمر بھر انتخابات میں حصہ لیتے رہے۔ ان کا وہ قول بھی اسلام تھا اور یہ فعل بھی اسلام۔ ان کے کشکول میں ہر قسم کا اسلام رکھا رہتا ہے۔ جس کی جس وقت ضرورت پڑے، اس میں سے نکال لیا جاتا ہے۔ ان کا اسلام بڑا آسان دین ہے۔

۲۔ اتحاد بین المسلمین کا عملی مظاہرہ

ذیل کا خط ملاحظہ فرمائیے:۔

نیوز ویکلی معیار کراچی ۳۱ دسمبر ۱۹۸۳ء سے ۶ جنوری ۱۹۸۴ء تک سے ایک اقتباس پیش خدمت ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ ہمارے علمائے کرام اسلام کی تبلیغ کا فریضہ بیرونِ ملک ادا کرتے ہیں اور لاکھوں روپے کما کر لاتے ہیں تو وہاں کس قسم کی تبلیغ کرتے ہیں۔

پیر صبغت اللہ قادری بیرسٹر جو اسٹینڈنگ کانفرنس آف پاکستانی آرگنائزیشنز کے صدر ہیں،

اپنے انٹرویو کے درمیان یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں :-

صدر موصوف ۲۲ سال سے برطانیہ میں مقیم ہیں۔

سوال: برطانیہ کے مختلف شہروں میں پاکستانیوں کے درمیان لڑائی جھگڑے کے واقعات ہوتے رہتے ہیں جس سے اتحاد اور یکجہتی کی فضا کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ آپ کے خیال میں اس کی کیا وجوہ ہیں اور نوجوان نسل پر اس کے کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں؟

جواب: حالیہ برسوں میں پاکستان سے برطانیہ آنے والے مولویوں، پیروں اور گدی نشینوں کی بھرمار ہوگئی ہے یہاں کی پہلی نسل کے لوگ مذہبی ہیں۔ مولویوں نے یہاں آکر ایک فرقے کے لوگوں کو دوسرے فرقے والوں سے لڑایا۔ عدالتوں کے حکم سے یہاں مسجدوں پر تالے پڑے۔ ایک موقعہ پر بقرعید کی نماز کے وقت آکسفورڈ میں مخالف گروپ نے عدالت میں جاکر مسجد کو بند کروا دیا کیونکہ امام دوسرے عقیدہ کا تھا۔ یہاں مسلمانوں نے سینکڑوں مسجدیں بنا رکھی ہیں۔ ایک سال مسجد بنتی ہے، دوسرے سال مسجد کا انتظام چلانے والی کمیٹی دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ برمنگھم میں رمضان کے دنوں برطانیہ میں دوسری سب سے بڑی مسجد کے اندر مسلمانوں کے درمیان چاقو چلے۔ اور پولیس نے مسجد کو بند کر دیا۔ وجہ تنازعہ یہ تھی کہ تراویح کی نماز کون پڑھائے۔ پھر عرب ملکوں سے چندہ حاصل کرنے کے لئے بھی نفاق کا بیج بویا جاتا ہے۔ اگر پاکستان اور بھارت سے آنے والے مولوی یہاں مسلمانوں کو مثبت مذہبی درس دیں تو اس پر کسی کو اعتراض نہیں۔ لیکن مشاہدے میں یہ بات آئی ہے کہ اکثر مولوی مسلمانوں میں نفرت پیدا کرنے کا رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اس صورت حال کا یہاں نوجوان نسل پر بہت بُرا اثر پڑ رہا ہے۔ پہلے ہی یہاں کا ماحول ایسا ہے جو انہیں اپنی روایت کیطرف نہیں لے جاتا۔ جب انہیں ماں باپ یہ نصیحت کرتے ہیں کہ نیشنل فرنٹ کے غنڈوں سے نہ جھگڑیں اور خود مقدس مقامات پر ایک دوسرے سے لڑتے ہیں تو اس کا نوجوانوں پر کیا اثر پڑے گا، آپ خود اندازہ کرلیں مجھے معلوم نہیں کہ حکومتِ پاکستان یا پاکستانی سفارتخانہ اس سلسلہ میں کیا کوشش کر رہا ہے۔

طلوعِ اسلام مسلمانوں کی مملکتیں اتحاد بین المسلمین کے لئے کانفرنسیں منعقد کرتی رہتی ہیں۔ اور ان کے مذہبی پیشوا اسی قسم کے "اتحاد" کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اگر حکومتِ پاکستان اس خطرہ کی روک تھام ضروری سمجھے، تو اس کے لئے سب سے مقدم کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ اس کی تحقیق کرے کہ ان حضرات کے پاس اس قدر روپیہ آتا کہاں سے ہے جس سے یہ سفر اور وہاں کے حضر کے اس قدر گراں بار اخراجات برداشت کرتے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ ان لوگوں کو اجازت نامے (ویزا) جاری کرنے میں خاص احتیاط برتے۔ یہ مسئلہ بڑی گہری توجہ کا متقاضی ہے۔

حقائق و عبر

ناموسِ پیغمبر کے محافظ

ہمارے ہاں (بدقسمتی سے) جو وضعی روایات بطور مسلّمات مانی چلی آتی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر چھ سال کی تھی اور رخصتی کے وقت ۹ سال کی۔ جب کہ حضورؐ کی عمر شریف قریب (۵۵) سال تھی۔ جس قلب میں ناموسِ رسالتمآبؐ کی ذراسی بھی رمق ہے وہ بلا تامّل کہہ دے گا کہ یہ اعدائے اسلام کی سازش ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کے "حاملانِ دینِ متین" حضرات اسے اپنے سینے سے لگائے چلے آتے ہیں کیونکہ یہ روایت صحیحین میں درج ہے۔ آج سے قریب تیس سال پہلے پرویز صاحب نے (خود انہی حضرات کی کتبِ روایات اور تاریخ سے) تحقیق کے بعد ثابت کیا کہ شادی کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر قریب (۱۹) سال تھی (دیکھئے طلوعِ اسلام بابت نومبر ۱۹۵۶ء اور "طاہرہ کے نام خطوط")۔ بجائے اس کے کہ یہ (علماء) حضرات پرویز صاحب کے شکر گزار ہوتے کہ انہوں نے اس دھبے کو دھو دیا ہے جس سے حضورؐ کی سیرتِ اقدس داغدار ہوتی جا رہی تھی، یہ (حسبِ عادت) ان کے پیچھے پڑ گئے کہ انہوں نے بخاری اور مسلم کی حدیث کو وضعی ثابت کر دیا ہے۔ اس شور و شغب کے بعد بطلوعہ

اب (فرقہ اہلحدیث کے ترجمان) ہفتہ وار الاعتصام کی اشاعت بابت (۲۴) فروری ۱۹۸۴ء میں ایک کتاب پہ تبصرہ شائع ہوا ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ سرگودھا سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ "کشف الغمۃ عن عمر ام الامۃ" جس میں اس روایت کی تردید کی گئی ہے کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر چھ سال کی تھی۔ اس کتاب کی تردید سرگودھا ہی کے ایک مولانا (ابو اسلام محمد صدیق صاحب) کی طرف سے شائع ہوئی ہے جس پہ الاعتصام نے تبصرہ کیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے:-

زیرِ تبصرہ کتاب اسی مذکورہ کتاب (کشف الغمۃ ...) کا پوسٹ مارٹم ہے جس میں ان منکرین حدیث کے مغالطات کا پردہ چاک کیا گیا ہے اور ان کی علمی خیانت اور بددیانتیوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے اور عقلی اور نقلی دلائل سے حضرت عائشہؓ کی صغرسنی کی اس شادی کا اثبات زور دار انداز سے کیا گیا ہے، جس کا ذکر صحیحین کی احادیث میں آیا ہے۔

اس کے بعد مصنف کے اس "جہادِ عظیم" کے لئے ان کی خدمت میں بایں الفاظ ہدیۂ تبریک و تحسین پیش کیا گیا ہے کہ:

صحیحین اور احادیثِ صحیحہ کے دفاع کے اس نہایت مبارک فریضہ کی ادائیگی پر مولانا موصوف

تمام اہلِ علم کی طرف سے شکریہ اور قدر افزائی کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس کوشش کو قبول فرمائے اور گم کردہ راہوں کی ہدایت کا ذریعہ بنا لے۔

یعنی ان حضرات کے نزدیک، مصنف کی یہ کوشش مستحق مبارکباد ہے کہ انہوں نے مسلم اور بخاری کی ان احادیث کا دفاع کیا ہے جن کی رُو سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضورؐ نے (۵۳ اور ۵۵ سال کی عمر میں) ایسی لڑکی سے شادی کی تھی جس کی عمر نکاح کے وقت (۶) سال اور رخصتی کے وقت (۹ سال) کی تھی![1] سوچیئے کہ شخصیت پرستی کی یہ کس قدر انتہا ہے کہ مسلم اور بخاری کے خلاف یہ اعتراض عائد نہ ہو کہ انہوں نے ایک وضعی روایت اپنے مجموعوں میں درج کر لی تھی خواہ اس سے سیرت نبی اکرمؐ کس قدر داغدار کیوں نہ ہو جائے!

ہم اس پر اپنی طرف سے کچھ کہنا نہیں چاہتے۔ انہی کے ایک امام، مولانا ابوالکلام (مرحوم) کے ایک تبصرہ پر اکتفا کرتے ہیں بخاری کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ نے تین مرتبہ جھوٹ بولا تھا (معاذ اللہ) اس روایت پر تنقید کرتے ہوئے وہ اپنی تفسیر ترجمان القرآن، جلد دوم (ص ۴۹۹) لکھتے ہیں۔

> ہمارے لئے یہ تسلیم کر لینا نہایت آسان ہے کہ ایک غیر معصوم راوی سے فہم و تعبیر حدیث میں غلطی ہو گئی بہ مقابلہ اس کے کہ ایک معصوم اور برگزیدہ پیغمبرؑ کو جھوٹا تسلیم کر لیں۔ اگر ایک راوی کی جگہ سینکڑوں راویوں کی روایت بھی ناقص ٹھہر جائے تو بہرحال غیر معصوم انسانوں کی غلطی ہو گی..... روایات کی قسموں میں سے کتنی ہی بہتر قسم کی کوئی روایت ہو، بہرحال ایک غیر معصوم راوی کی شہادت سے زیادہ نہیں، اور غیر معصوم کی شہادت ایک لمحہ کیلئے بھی یقینیاتِ دینیہ کے مقابلہ میں تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ جب مان لینا پڑیگا کہ یہ اللہ کے رسولؐ کا قول نہیں ہو سکتا۔ یقیناً یہاں راوی سے غلطی ہوئی ہے، اور ایسا مان لینے سے نہ تو آسمان پھٹ پڑے گا، اور نہ زمین شق ہو جائیگی۔

لیکن اس کے برعکس ان حضرات کا عقیدہ یہ ہے کہ بخاری یا مسلم وغیرہ کے متعلق یہ نہ کہا جائے کہ انکے مجموعوں میں کوئی ضعیف روایت بھی ہے، خواہ اس سے خدا کے برگزیدہ رسولؐ کا دنیا کی نظروں میں کس قسم کا تصور بھی کیوں نہ قائم ہو جائے۔ بقول مولانا آزاد (مرحوم):-

> ان لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ ان کے سامنے جونہی بخاری مسلم کا نام آجاتا ہے بالکل درماندہ ہو کر رہ جاتے ہیں اور پھر کوئی دلیل اور حجت بھی انہیں اس پر تیار نہیں کر سکتی کہ انکی کسی روایت کی تضعیف پر اپنے آپ کو راضی کر سکیں۔ (ص ۵۰۰)

یہی احبار و رہبان کو فوق البشر قرار دینا ہے یعنی انہیں منزہ عن الخطا سمجھنا۔

---

[1] سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) نے کہا ہے کہ نابالغ لڑکی سے جنسی اختلاط بھی جائز ہے۔ قرآن کریم نے نکاح کے لئے بلوغت کو شرط قرار دیا ہے۔

اتحادِ ملت کی واحد بنیاد ـــ کتاب و سنت

ہم مولوی صاحبان کی خدمت میں شروع سے گذارش کرتے چلے آرہے ہیں کہ اگر آپ واقعی چاہتے ہیں کہ "کتاب و سنت" کے مطابق قوانین وضع ہوں تو کرنے کا کام یہ ہے کہ مختلف فرقوں کے نمائندگان اکٹھے ہو کر سنتِ رسول اللہ کا ایسا مجموعہ مرتب کریں جس پر سب کا اتفاق ہو۔ ان کی طرف سے اس تجویز کا جواب کفر کے فتووں کے سوا کچھ نہ تھا۔ اب ایسا نظر آتا ہے کہ انہوں نے تسلیم کرنا شروع کر دیا ہے کہ اس کا علاج اس کے سوا کچھ ہے نہیں۔ ہفتہ وار الاعتصام، فرقہ اہلحدیث کا مؤقر ترجمان ہے۔ اس کی ۵ مارچ سنہ ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں عنوان بالا کے تحت اداریہ شائع ہوا ہے۔

اس سے پہلے، جمعیت علمائے پاکستان کے جنرل سیکرٹری مولانا عبدالستار خان نیازی کے ایک بیان کا ملخص شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ "جتنے اختلافی مسائل ہیں انہیں جمع کیا جائے اور مختلف مکاتبِ فکر کے نمائندہ علمائے کرام کو اکٹھا کر کے ان سے کہا جائے کہ وہ کتاب و سنت کی روشنی میں انہیں حل کریں"۔ اس پر الاعتصام نے حسبِ ذیل اداریہ سپردِ قلم فرمایا ہے۔

> حکومت کے پاس وہ تمام وسائل موجود ہیں جن کو بروئے کار لا کر وہ عوام الناس کو عقیدہ اور عمل کے لحاظ سے ایک پلیٹ فارم پر جمع کر سکتی ہے۔۔۔۔۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ آپ تمام مکاتبِ فکر کے علماء کو عقائد میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے ایک کنونشن میں جمع کریں۔ ان کے سامنے کتاب و سنت کی میزان رکھیں اور پھر ان کو مجبور کریں کہ وہ اپنے اور اپنے پیروکاروں کے عقائد و اعمال کو اس میزان پر تول کر پورا کریں۔۔۔۔۔۔ اور پھر اس کنونشن کو اس وقت تک برخاست نہ کریں جب تک علماء اپنے عقائد کو کتاب و سنت کے واضح عقائد کے مطابق قائم کرنے کا اعلان نہ کریں۔ اور ملک میں غیر شرعی اور غیر اسلامی حرکات و اعمال کو ترک کر دینے کا وعدہ نہ کریں۔۔۔۔۔ یہاں اسلامی نظام نافذ کرنے کا کوئی دوسرا نسخہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔"

اس کے بعد انہوں نے صدرِ مملکت کو مخاطب کر کے کہا ہے۔

> ہم محترم صدرِ پاکستان جنرل ضیاء الحق صاحب سے گذارش کریں گے کہ وہ اپنی کاسابلانکا کی تقریر کے اس حصے پر پھر سے غور فرمائیں جس میں انہوں نے کہا تھا کہ اسلام میں کوئی دایاں بایاں بازو نہیں ہے۔ اسلام کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا راستہ ہے۔۔۔۔۔۔

اس صورت میں محمد رسول اللہ کا راستہ صرف ایک ہی راستہ ہے۔ اور وہ ہے کتاب و سنت۔ ان کو چاہئیے کہ وہ کتاب و سنت پر علمائے امت کو جمع کریں۔ اور تمام جزئیات و فروعات کے جھگڑے بھی اسی مشعل کی روشنی میں حل کر لیں۔ اسی سے تمام مکاتبِ فکر ایک پلیٹ فارم

پر جمع ہو سکیں گے اور اسی سے نفاذِ اسلام کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکے گا۔ اس کے علاوہ نہ تدبیریں کارگر ہوں گی نہ شمشیریں کام آئیں گی۔ اور اختلافات کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی جائے گی۔

ہم جانتے ہیں کہ (نظر بظاہر) "نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچیگی"۔ دیگر فرقوں کو چھوڑیئے۔ مولانا نیازی بریلوی فرقہ سے متمسک ہیں اور الاعتصام، اہلحدیث کا نمائندہ ہے۔ بریلوی فرقہ کے ممتاز قائد مولانا نورانی نے، صدرِ مملکت سے بڑے فخر سے کہا تھا کہ وہ امام حرم کے پیچھے بھی نماز نہیں پڑھتے جن کا تعلق اہلحدیث سے ہے۔ جو لوگ ایک دوسرے کے پیچھے نماز تک نہیں پڑھتے وہ متفق علیہ جمہور سنت کس طرح مرتب کر سکیں گے ؟ بایں ہمہ؛ ہم انتظار کرتے ہیں کہ الاعتصام کی اس تجویز کا نتیجہ کیا برآمد ہوتا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ "یہاں اسلامی نظام نافذ کرنے کا کوئی دوسرا نسخہ کامیاب نہیں ہو سکتا"۔ اگر ان کی یہ تجویز ناکام رہی تو (ہمیں امید ہے کہ اس کے بعد وہ (طلوعِ اسلام کی ہمنوائی میں) اتنا ضرور کہیں گے کہ یہاں نفاذِ اسلام کے راستے میں خود علماء کرام حائل ہیں"۔ دیانت کا تقاضا تو یہی ہوگا کہ وہ اس کا اعتراف اور اعلان کریں۔ فانتظروا انی معکم من المنتظرین۔

اونٹ کا بچہ

محترم وفاقی وزیرِ تعلیم نے اگلے دنوں فرمایا تھا کہ ہمارے نظامِ تعلیم کے اونٹ کی کوئی کل بھی سیدھی نہیں۔ ان کے سامنے (یقیناً) بڑے بڑے اونٹ ہوں گے۔ ہمیں اونٹ کے ایک بچے کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ آیئے۔ آپ کو اس کی دو ایک کلیں دکھائیں۔ کتاب کا نام ہے

برائے جماعت دوم ——— دینیات۔ لازمی

مصنف ہیں عزیز الرحمٰن عزیز۔ ایم اے بی ٹی (۲) منظور الحق فاروقی ایم اے۔ اور (۳) فضل حق اقبال پرنسپل شمسیہ کالج فیصل آباد۔ اس کا ایک عنوان ہے۔ ملائکہ۔ اس کے تحت لکھا ہے:۔

سوال:۔ فرشتے کون ہیں ؟

جواب:۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کی ایک مخلوق ہیں۔ نور سے پیدا کئے گئے ہیں۔ جو ہمیں نظر نہیں آتے۔ وہ نہ مرد ہوتے ہیں نہ عورت۔ فرشتے گناہ سے پاک ہوتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی تعریف اور عبادت میں لگے رہتے ہیں ؟

کتاب کے فاضل مصنفین تو ایک طرف، کیا محکمہ تعلیم کے جید دانشور مل کر بھی پانچ چھ سال کے بچے کو سمجھا سکتے ہیں کہ فرشتوں کے متعلق جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس کا مطلب کیا ہے !

باسمہ تعالیٰ

بتقریب یومِ پاکستان سنہ ۱۹۸۴ء

پہلا پاکستانی کون تھا؟

وہ جس کے خلاف مکہ مدینہ سے
کفر کے فتوے منگائے گئے تھے

از
پرویز

باسمہٖ تعالیٰ

پہلا پاکستانی کون تھا؟

پرویز

عزیزانِ گرامی قدر! سلام و رحمت!

۲۳ مارچ، مملکتِ پاکستان کا یومِ تاسیس ہے۔ اس تاریخ کو آج سے ۴۲ سال پہلے اسی لاہور میں ملّتِ اسلامیہ نے اپنی آزاد مملکت قائم کرنے کے عزم کا اظہار کیا تھا۔ اس اعتبار سے یہ دن اس کا مستحق ہے کہ اس کی یاد قائم رکھی جائے۔ لیکن اس اساس کا سلسلہ اس سے بھی ساٹھ ستّر سال پہلے شروع ہوا تھا جب، درحقیقت ایوانِ پاکستان کی بنیاد کی اینٹ رکھی گئی تھی۔ بنابریں میں اس تقریب کی ابتدا اکثر و بیشتر اسی زمانے سے کیا کرتا ہوں۔ چنانچہ آج بھی میں اس گفتگو کا آغاز وہیں سے کروں گا، اور اسی استعارے کے ساتھ جو اس داستانِ انقلاب کا موزوں ترین نقطۂ آغاز ہے۔ ؎۱

کہتے ہیں کہ جب سیمرغ کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کی زندگی کے آخری دن قریب آگئے ہیں تو وہ اپنے گرد تنکے جمع کر لیتا ہے اور اس آشیانہ میں بیٹھ کر دیپک راگ الاپتا ہے۔ جس سے اس کے پروں سے شعلے نکلتے ہیں۔ ان سے اس کا آشیانہ بھی جل جاتا ہے، اور خود بھی راکھ کا ڈھیر بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کے بعد اس راکھ پر بارش کا چھینٹا پڑتا ہے تو اس میں سے ایک نیا سیمرغ پیدا ہو جاتا ہے۔

سیمرغ کے متعلق تو معلوم نہیں، لیکن جن قوموں میں زندگی کی کوئی رمق باقی ہوتی ہے، حوادثِ زمانہ انہیں جلا کر راکھ کا ڈھیر بھی کیوں نہ بنا دیں، ان کی خاکستر کے نیچے دبی ہوئی چنگاری ابھرتی ہے اور اس سے ایک ایسا زندہ انسان نمودار ہوتا ہے جو اس قوم کو حیاتِ نو عطا کر دیتا ہے۔ اقبالؒ نے اسی طرف اشارہ کیا تھا جب کہا تھا کہ

پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے — ہو صداقت کیلئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے — پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار

سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد ـــــ جسے انگریز کی استعماریت نے "غدر" سے تعبیر کر کے تاریخ کو مسخ کرنے کی مذموم کوشش کی تھی ـــــ ہندی مسلمان یکسر راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئے تھے۔ انکی سلطنت ہی نہیں چھنی تھی، ان کی ملّی ہستی ختم ہو گئی تھی۔ ان کا جداگانہ تشخص مٹ گیا تھا

؎۱ ایک افسانوی پرندہ جسے کوئی سیمرغ کہتا ہے کوئی ققنس۔ کوئی موسیقار۔ انگریزی میں اسے (PHOENIX) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

ان کی اجتماعیت باقی نہیں رہی تھی۔ وہ ایسے کمزور و ناتواں تنکوں کی مانند تھی جنہیں زمانے کے جھکڑ ادھر ادھر اڑائے اڑائے پھرتے تھے۔ عزت و آبرو، دولت و حشمت تو ایک طرف، ان خانماں برباد وں کے لئے نہ بیٹھنے کا ٹھکانہ تھا، نہ کھانے کو روٹی۔ انگریز انہیں اس "غدر" کا واحد ذمہ دار قرار دے کر عبرت آموز سزا دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہندو نے بھی یہ تہیہ کر لیا تھا کہ وہ انگریزوں کے ساتھ مل کر اپنی ہزار سالہ غلامی کا انتقام ان مسلمانوں سے لے گا جو کسی نہ کسی طرح زندہ بچ گئے تھے۔

۱۸۵۷ء کے بعد کی حالت

اس وقت کوئی آفت ایسی برپا نہیں ہوئی جس کے متعلق یہ نہ کہا گیا ہو کہ اسے مسلمانوں نے برپا کیا تھا۔ خواہ اسے رام دین اور ماتا دین نے ہی برپا کیوں نہ کیا ہو۔ کوئی بلا آسمانوں سے ایسی نہیں آئی جس نے سب سے پہلے مسلمانوں کا گھر نہ تاکا ہو۔ کوئی کانٹوں والا درخت اس زمانے میں نہیں اُگا جس کی نسبت یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے بویا ہے۔ کوئی آتشیں بگولا نہیں اٹھا جس کے بارے میں یہ مشہور نہ کیا گیا ہو کہ اسے مسلمانوں نے اٹھایا ہے۔ (لائل محمڈنز آف انڈیا۔ سرسیدؒ)

یہ تھے وہ قیامت خیز اور مرگ آفرین حالات جن میں خود انگریزی حکومت کے دفتر کا ایک ملازم اس قوم کی خاکستر سے چنگاری بن کر ابھرا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے عروقِ مُردہ میں زندگی بخش حرارت بن کر سرایت کر گیا۔ یہ تھا وہ بطلِ جلیل جو دنیا میں سرسیدؒ کے لقب سے متعارف ہوا۔ اس وقت قوم کی کیا حالت تھی، اس کے متعلق اس نے خود بعد میں کہا تھا کہ،

بیں اس وقت ہرگز یہ نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپ سکے گی اور پھر نو عزت پانے کے قابل ہو جائیگی۔ آپ یقین کیجئے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید ہو گئے۔

انگریز کے وحشیانہ استبداد کا یہ عالم تھا کہ اس نے محض شکوک و شبہات کی بنا پر ابناءِ قوم کو چن چن کر حوالۂ دار و رسن کر دیا تھا۔ اسکے کسی فیصلے یا اقدام کے خلاف، ذرہ سی لب کشائی کی سزا مرگِ مفاجات تھی۔ اس لئے ساری قوم سہمی، دبکی ہوئی، ساکت و صامت مہر بلب بیٹھی تھی۔ ان حالات میں سرسیدؒ نے ایک رسالہ لکھا جس کا عنوان ہی "اسبابِ بغاوتِ ہند" تھا اس میں اس نے ان الزامات کی تردید کی جو حکومت کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف عائد کئے جاتے تھے۔ اس رسالہ نے ہندوستان اور انگلستان کے سیاسی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا۔ انگریز کے دل میں اس کے خلاف غیظ و غضب کا کس قدر طوفان ابھرا تھا اس کا اندازہ گورنمنٹ آف انڈیا کے اس وقت کے فارن سیکرٹری (مسٹر بیڈن) کے ان الفاظ سے لگائیے جس میں اس نے کہا تھا۔

اس شخص نے نہایت باغیانہ مضمون لکھا ہے۔ اس سے حسبِ ضابطہ فوراً بازپرس کی جائے اور اگر کوئی معقول جواب نہ دے سکے تو سخت سزا دی جائے۔

جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے یہ جرأت رندانہ اس شخص کی تھی جو انگریز کی حکومت میں ایک معمولی درجہ کا ملازم تھا۔ لیکن حق کی یہ آواز اپنا کام کر گئی۔ چنانچہ انگلستان کے اس زمانہ کے ایک مشہور اخبار "ہوم نیوز" نے اس رسالہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا۔

سید احمد خان نے انتہائی دلیری سے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور یہ بات محتاجِ بیان نہیں کہ اس کی اس جرأت مندانہ رائے نے حکمران طبقہ کو بے حد متاثر کیا ہے۔

اس اثر انگیزی کا نتیجہ تھا کہ قید و بند اور دار و رسن کا وہ طوفان تھم گیا جس نے اس بے بس و بےکس قوم کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ ایک آواز نے کسطرح پہاڑوں کے دل چیر کر رکھ دیئے، تاریخ میں اس کی بہت کم مثالیں ملیں گی۔

وہابی تحریک

بغاوتِ ہند کے علاوہ مسلمانوں کے نعماء قوم کو ذبح کرنے کا ایک اور بہانہ بھی انگریز کے ہاتھ آگیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے بہت پہلے پنجاب اور سرحد میں سید احمد بریلوی (علیہ الرحمۃ) کے زیرِ قیادت جہاد کی ایک تحریک ابھری تھی جسے "وہابی" تحریک کے نام سے مشہور کیا گیا تھا۔ تحریک تو وہ ختم ہوگئی (یا بعض کے خیال میں دب گئی) تھی، لیکن جہاد کا تصور انگریز کو ہوا بن کر ڈراتا تھا۔ اس ڈر سے اس کی دیوانگی کا یہ عالم تھا کہ جس شخص کے متعلق بھی یہ کہہ دیا جاتا کہ وہ "وہابی ہے" اسے حوالۂ دار و رسن کر دیا جاتا۔ چنانچہ کسی شہر اور قریہ میں کوئی ایسا درخت نہیں تھا جس پر ان "وہابیوں" کی لاشیں لٹکتی، تڑپتی دکھائی نہ دیتی ہوں۔ اس عالمگیر خونِ ناحق کے احساس سے "سرسید" کا خون کھول گیا کافی غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس آگ کی شعلہ فشانیوں کو فرو کرنے کے لئے اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں کہ اس میں "مثلِ خلیل" خود کود جائے۔ چنانچہ اس نے ہندوستان ہی میں نہیں، انگلستان کی پارلیمان کے ایوانوں تک کو اپنے اس نعرۂ مستانہ سے ہلا دیا کہ:

اگر وہابی ہونا کوئی جرم ہے تو سن رکھو کہ سب سے بڑا وہابی میں ہوں۔

حیرت ہے کہ انگریز کو اس کی کیوں جرأت نہ ہوئی کہ اس سب سے بڑے وہابی کا سر قلم نہ کرتا تو کم از کم اسے کالے پانی ہی بھجوا دیتا جسے اس نے اس زمانے کے وہابیوں کا دارالمحن بنا رکھا تھا اور جہاں کی صعوبات و عقوبات کے تصور سے آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بہرحال، سرسیدؒ کے ایک رسالہ نے جہاں "بغاوت" کے عواقب سے مظلوم مسلمانوں کی جان چھڑائی تھی، اس کے اس نعرۂ مستانہ نے "وہابیت" کے استبداد سے انہیں نجات دلا دی۔

سرسیدؒ کے یہ اقدامات مدافعانہ تھے، یعنی اس نے ان سے ان سازشوں کی روک تھام کر دی جو مسلمان قوم کو ہندوستان میں ختم کرنے کے درپے تھی۔ اس کے بعد اس نے اس پر غور کیا کہ انہیں زندہ قوموں کی صف میں لانے کے لئے کیا کیا جائے۔ اس نے دیکھا کہ ہندو نے اس راز کو پا لیا تھا کہ انگریزوں نے اس ملک میں اپنی حکومت قائم کرنی ہے۔ ایوانات حکومت میں دخیل اور رموزِ مملکت میں شریک ہونے کے لئے ضروری ہوگا کہ اس قوم کی زبان سیکھی جائے اور اُن علوم کو حاصل کیا جائے جن کی بدولت انہوں نے یہ عروج حاصل کر رکھا ہے۔

سرسیدؒ نے دیکھا کہ "بغاوتِ ہند" کے ایک ہی سال بعد کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں جدید علوم کی یونیورسٹیاں قائم ہو گئی ہیں جن میں ہندو جوق درجوق داخل ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کے علماء کرام نے فتویٰ دے رکھا ہے کہ انگریزی پڑھنا حرام ہے۔ اس نے جلد محسوس کر لیا کہ مسلمانوں کی حیاتِ ملّی کو ختم کرنے کے لئے یہ سازش تیغ و تبر سے بھی زیادہ ہلاکت آفرین ہے۔ وہ تنہا اور بے یار و مددگار تھا۔ اس کے ہاں اسباب و ذرائع کا یکسر فقدان تھا۔ بایں ہمہ اس نے پہلا قدم بہر حال اٹھا لیا۔ اور ۱۸۶۳ء میں جب کہ وہ غازی پور میں تعینات تھا، ایک سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد رکھ دی جس کا مقصد یہ تھا کہ عصرِ حاضر کے علوم سے متعلق جو کتب انگریزی زبان میں شائع ہوں، ان کا اردو میں ترجمہ کیا جائے، تاکہ مسلمان ان علوم سے واقفیت حاصل کر لیں، اور اس کے بعد ان کے دل میں ان کی تحصیل کا شوق پیدا ہو جائے۔

نیچری یہاں ایک لطیفہ سامنے آگیا ——— "خارجی کائنات (یعنی نیچر) سے متعلق علوم" کا اردو زبان میں ترجمہ "علومِ فطرت" ہی کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس زمانے میں لفظ "فطرت" کا وہ مفہوم عام طور پر سامنے نہیں آیا تھا جو انگریزی کے لفظ "نیچر" میں مضمر تھا۔ سرسیدؒ نے مناسب سمجھا کہ اس کے لئے "نیچر" کا لفظ ہی رہنے دیا جائے۔ ہمارے علماء حضرات کو خاک علم کہ اس سے سرسیدؒ کا مفہوم کیا تھا! انہوں نے اتنا ہی سمجھا کہ یہ الحاد و بیدینی کی طرف دعوت ہے۔ چنانچہ انہوں نے سرسیدؒ کے خلاف جو کفر کے فتوے صادر فرمائے تھے ان میں یہ بھی کہا تھا کہ یہ شخص "نیچری" ہے۔ حتیٰ کہ رفتہ رفتہ انہوں نے یہ بھی مشہور کر دیا کہ "نیچری" ایک فرقہ ہے۔ چنانچہ جو شخص کوئی معقول بات کرتا، اس کے متعلق کہہ دیا جاتا کہ وہ نیچری ہے یعنی مُلحد اور بے دین۔

سائنٹفک سوسائٹی کے قیام کے بعد سرسیدؒ نے دوسرا قدم اٹھایا اور غازی پور میں جدید خطوط پر ایک مدرسے کی داغ بیل ڈال دی۔ جب وہ غازی پور سے تبدیل ہو کر علی گڑھ آیا تو سائنٹفک سوسائٹی کا مرکز بھی علی گڑھ منتقل ہو گیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے سوسائٹی کا اخبار ——— علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جاری کیا جس کی وساطت سے علومِ جدیدہ کی اہمیت اور افادیت کا چرچا دُور دُور تک ہونے لگا۔

یورپ کا سفر

یہ سب کوششیں ابتدائی اور مقامی سی تھیں۔ مسلمانوں کے مستقبل کے متعلق وہ جو کچھ سوچ رہا تھا اس کے لئے وسیع تر افق کی ضرورت تھی۔ وہ ایک عملی انسان تھا۔ اس نے اندازہ لگالیا کہ جب تک اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا جائے کہ اقوامِ مغرب اس مقام پر کس طرح پہنچی ہیں، مسلمانوں کو ان کے ہمدوش لانے اور ہمقدم بنانے کے لئے کوئی مؤثر قدم نہیں اٹھایا جا سکتا۔ اس کے لئے اس نے طے کیا کہ وہ خود انگلستان جائے گا۔ اس زمانے میں یورپ کا سفر آسان بات نہیں تھی سب سے بڑا مسئلہ اخراجات کا تھا۔ اس مقصد کے لئے سرسیدؒ نے اپنے کتب خانہ کو بیچا۔ کوٹھی کو رہن رکھا۔ اور اس زادِ سفر کے ساتھ ۱۸۶۹ء میں عازمِ انگلستان ہوگیا۔ قریب دو سال کے بعد وہ واپس لوٹا اور ایک کمیٹی بنائی کہ وہ تحقیق کرے کہ مسلمان تعلیم میں پیچھے کیوں ہیں اور ان کی ترقی کے لئے کیا طریقِ عمل اختیار کیا جائے۔ چنانچہ کافی غور و خوض کے بعد طے پایا کہ نمونۃً ایک ایسے مدرسے کا اجراء کیا جائے جس سے قوم کو معلوم ہو کہ ان کے پیشِ نظر مقصد کیا ہے۔ چنانچہ ۲۴ مئی سنہ ۱۸۷۵ء کو اس مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی جسے میں پاکستان کی بنیاد کی اینٹ قرار دیا کرتا ہوں۔ اس مدرسہ کا آغاز کس بے مائیگی کے عالم میں ہوا تھا اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب پڑھائی شروع ہوئی تو طلباء کی تعداد سات تھی اور سکول کا ماہوار بجٹ قریب -/۹۰ روپے۔ پہلے ہیڈ ماسٹر کی تنخواہ چالیس روپے تھی۔ اس کے بعد سرسیدؒ نے چندہ جمع کرنے کے لئے طوفانی دورے شروع کر دیئے۔ اس کے لئے انہوں نے کیا کیا طریق اور انداز اختیار کئے، ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ نتیجہ یہ کہ بارہ ہی برس بعد یہ غریب سا مدرسہ علی گڑھ کالج کی شکل اختیار کر گیا۔

کالج

۱۸۷۵ء میں جب علیگڑھ مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی تھی تو ملک میں قریب (۸۵۰) ساڑھے آٹھ سو ہندو گریجویٹ تھے، اور صرف بیس مسلمان۔ علیگڑھ کالج کے قیام کے بعد بیس سال کے عرصے میں ملک میں ایک سو چھبیس مسلمان گریجویٹ تھے، اور ۱۷۴ انڈر گریجویٹ۔ اس کالج نے اتنا ہی نہیں کیا۔ اس نے اس آہنی دیوار کو بھی توڑ دیا جو علومِ حاضرہ اور مسلمانوں کے درمیان کفر کا حجاب بن کر حائل تھی۔ چنانچہ ملک کے دیگر مقامات مثلاً لاہور، امرتسر، کراچی، حیدرآباد، بہاولپور وغیرہ میں مسلمانوں کے سکول اور کالج کھلنے شروع ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جہاں سنہ ۱۸۸۱ء تک ملک میں صرف ۴۰۳ مسلمان گریجویٹ تھے، سنہ ۱۸۹۳ء تک ان کی تعداد ۳۳۹ تک پہنچ گئی تھی اور سنہ ۱۸۹۸ء تک صرف الہ آباد اور پنجاب میں ان کی تعداد ۱۸۵ تھی۔ عام تعلیم کی حالت یہ تھی کہ بنگال میں ۱۸۸۱ء میں کالجوں اور سکولوں میں ایک لاکھ پچاسی ہزار مسلمان تھے۔ اور ۱۸۹۲ء میں ان کی تعداد چار لاکھ نوّے ہزار تک پہنچ گئی تھی۔

کفر کے فتوے

مجھے اس کا احساس ہے کہ آپ کو نہ تو ان تاریخی تفاصیل میں کوئی خاص جاذبیت اور دلکشی محسوس ہوئی ہوگی اور نہ ہی تعلیم گاہوں اور طلباء کی اس تعداد میں کوئی اہمیت۔ آج ایک شہر میں ان سے کتنی گنا زیادہ طلباء کی تعداد ہوتی ہے۔ اس کی اہمیت کے متعلق میں ذرا آگے چل کر عرض کروں گا۔ اس وقت صرف یہ دیکھئے کہ سرسید اس لٹی پٹی قوم کی بازآفرینی کے لئے یہ کچھ کر رہا تھا، اور ہمارے علمائے کرام اس کے پیچھے کفر کا ڈنڈا لئے لئے پھر رہے تھے جب اس نے مدرسہ کی بنیاد رکھی تو ایک مولوی صاحب نے فتویٰ صادر کر دیا۔

جو لوگ مدرسۃ العلوم قائم کرنا چاہتے ہیں وہ درحقیقت مسلمان نہیں۔

جب سرسید کی کوششیں کچھ اور آگے بڑھیں تو دہلی سے ایک مفتی صاحب (مولوی کریم اللہ) اٹھے اور انہوں نے فتویٰ دے دیا کہ۔

ایسے ناپاک کا نام مدرسہ رکھنا اور محل تعلیم و تحصیل سمجھنا آدمیت سے نکلنا ہے اور زمرۂ جہلا ایت میں داخل ہونا ہے۔ بالکل عاطل، بلکہ صرف کرنا مال کا ایسے محل میں موجب گندہ ہونا جہنم اور ایسے بے محل میں مساعی ہونا ہے اور حطب بننا لازم۔ الحاصل معاونت ایسے غارتیٔ ایمان اور مال کی اور بلاشبہ سمجھنا اپنے مال کا خیال خام ہے۔ سے نے یوں سمجھو کہ اپنے ہاتھ سے جہنم میں مکان تعمیر کرنا ہے۔

فرنگی محل (لکھنؤ) کے مولوی عبدالحئی صاحب آگے بڑھے اور فرمایا:-

یہ شخص مخربِ دین اور ابلیس لعین کے وسوسے سے صورتِ اسلام میں تخریبِ دینِ محمدی کی فکر میں ہے۔

حرمین سے فتوے منگائے گئے

جب یہاں کے فتووں سے جی نہ بھرا تو دوڑے دوڑے مکہ معظمہ پہنچے اور وہاں سے مفتیانِ مذاہبِ اربعہ کا فتویٰ حاصل کیا جس میں لکھا تھا۔

یہ شخص ضال اور مضل ہے بلکہ ابلیس لعین کا خلیفہ ہے اس کا فتنہ یہود و نصاریٰ کے فتنے سے بھی بڑھ کر ہے۔ خدا اس کو سمجھے۔

اس سے بھی آگے بڑھے تو مدینہ منورہ پہنچے اور وہاں سے یہ فتویٰ حاصل کیا کہ،

یہ شخص یا تو ملحد ہے یا شرع سے کفر کی جانب مائل ہوگیا ہے۔ پس اگر اس شخص نے گرفتاری سے قبل توبہ کر لی اور ان کفر ایہوں سے رجوع کر لیا تو قتل نہ کیا جائے ورنہ اس کا قتل واجب ہے دین کی حفاظت کے لئے اگر اس کا مدرسہ بن جائے تو اس کا منہدم کر دینا واجب ہے۔

سرسید ملک کے گوشے گوشے میں جھولی بغل میں ڈالے امتِ مرحومہ کے تحفظ کے لئے بھیک مانگتا

بھیجتا اور ہمارے یہ حامیانِ دینِ متین اور علمبردارانِ شرعِ مبین اس کے پیچھے فتاویٰ کا پلندہ لئے پھرتے تھے۔ جہاں اس کا لیکچر ہوتا شور مچا دیا جاتا۔ لوگوں کو مشتعل کر کے فساد کرا دیا جاتا۔ چندہ دینے والوں کو گھیر گھیر کر روک دیا جاتا۔ عوام کو اس کے قتل کے لئے اکسایا اور بھڑکایا جاتا تھا۔ آئے دن قتل کی دھمکیوں کے خطوط اور پیغام ملتے رہتے۔ سفر اور حضر میں اس کے لئے خطرے کے سامان پیدا کئے جاتے۔

سر سیدؒ نے کفر کے ان فتووں کے جواب میں نہ کسی کو گالی دی، نہ کسی پہ غصے کا اظہار کیا۔ اصولی طور پہ ایک ایسی بات کہی جسے اس قسم کے فتووں کے جواب میں پورے اعتماد کے ساتھ ہر زمانے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

سر سیدؒ نے کہا:۔

> ہم کو ملحد، زندیق اور لامذہب کہنا کچھ تعجب نہیں ہے۔ کیونکہ ہماری قوم نے خدائے ذوالجلال سوا باپ دادا کے رسم و رواج کو، اور اپنے قدیمی چال چلن کو دوسرا خدا مانا ہے۔ اور پیغمبر آخر الزماں محمد رسول اللہؐ کے سوا اور بہت سے پیغمبر پیدا کئے ہیں۔ کتاب اللہ کے سوا انسانوں کی بنی ہوئی بہت سی کتابوں کو قرآن بنایا ہے۔ اور ہم اس جھوٹے خدا اور فرضی پیغمبروں اور جعلی قرآنوں کو ایسا ہی برباد کرنے والے ہیں جیسے ہمارے جدِ امجد ابراہیمؑ اپنے باپ آذر کے بت توڑنے والے تھے۔ ہم سچے خدائے ذوالجلال اور سچے پیغمبر محمد رسول اللہ کی نبوت اور سچی کتاب اللہ کی اطاعت دنیا میں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ پھر وہ لوگ ہم کو ملحد و زندیق و لامذہب نہ کہیں اور نہ سمجھیں تو کیا کہیں اور کیا سمجھیں۔ کیونکہ ہم ان کے خداؤں اور پیغمبروں اور قرآنوں کو نہیں مانتے۔

وہ کفر کے فتووں کا تو کچھ اثر نہ لیتے، لیکن جب یہ حضرات ان کے چندہ کی مہم کے خلاف اوچھے ہتھیاروں پہ اتر آتے تو انہیں بڑا دکھ ہوتا۔ وہ اپنے ایک دوست کو نہایت دلدوزی اور جگر سوزی کے ساتھ اپنے خط میں لکھتے ہیں:۔

> افسوس خدا ہاتھ نہیں آتا۔ جناب رسول اللہؐ موجود نہیں۔ ورنہ ان میں سے ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر ان کے سامنے لے جاتا اور کہتا کہ اے خدا! اے جناب رسولِ خدا! محاکمہ کرو تم مجھ میں اور ان میں اور بتاؤ کہ تمہارا دوست۔ واللہ آخر کون ہے۔ میں گنہگار یا یہ دیندار! اور انشاء اللہ اگر خدا سچ ہے اور قیامت درست ہے تو یہ معرکہ ہو کر رہے گا۔

جہاں تک ان کی اپنی ذات کا تعلق تھا وہ کفر و الحاد کے ان فتووں سے اثر نہیں لیتے تھے لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے جب یہ حضرات کالج کے لئے چندہ کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے تھے تو اس سے سر سیدؒ کو بہت دکھ ہوتا تھا۔ کس قدر دکھ ہوتا تھا اس کا اندازہ ان کی اس تقریر کے چند فقروں سے لگائیے جو انہوں نے لاہور میں اس وقت

کہ جب وہ کالج فنڈ کے لئے پنجاب کا دورہ کر رہے تھے اور مولوی صاحبان ان کے پیچھے ڈگڈگی لئے پھر رہے تھے۔ انہوں نے اس عظیم اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا:۔

لاہور میں خطاب

"اے بزرگانِ پنجاب! میں فرض کرتا ہوں کہ میں بد عقیدہ ہوں، مگر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر و مرتد آپ کی قوم کی بھلائی کے لئے کوشش کرے تو کیا آپ اسے اپنا خادم، اپنا خیرخواہ نہیں سمجھیں گے؟ آپ کی دولت سرا بنانے میں جس میں آپ آرام فرماتے ہیں اور آپ کے بچے پرورش پاتے ہیں، آپ کے لئے مسجد بنانے، جس میں آپ خدائے واحد ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں، چوہڑے چمار، قلی، کافر، بت پرست اور بدعقیدہ سب ہی مزدوری کرتے ہیں۔ مگر آپ نہ کبھی اس دولت خانہ کے دشمن ہوتے ہیں نہ کبھی اس مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ بس آپ مجھ کو بھی اس مدرستہ العلوم کے قائم کرنے میں ایک قلی، چمار کی مانند تصور کیجئے اور میری محنت اور مشقت سے اپنے لئے گھر بننے دیجئے اور اس وجہ سے کہ اس کا بنانے والا یا اس میں مزدوری کرنے والا ایک قلی چمار ہے اپنے گھر کو مت ڈھایئے۔ کیا آپ صاحب مجھ بدبخت، نامۂ سیاہ کی شامتِ اعمال سے اپنی قوم کو اور ان کی اولاد کو نسلاً بعد نسلاً ڈبونا اور خراب و خستہ حالت میں ڈالنا چاہتے ہیں؟ اگر آپ صاحب، میری حالت کو بدتر جانتے ہو تو اس سے عبرت پکڑو لیکن برائے خدا اپنی قوم کی، اپنی اولاد کی بھلائی اور بہتری کی تو فکر کرو۔"

مولانا حالیؔ کا بیان ہے کہ سرسید کے منہ سے یہ الفاظ نکل رہے تھے اور سامعین پر سکتہ کا عالم طاری تھا کوئی مسلمان ایسا نہ تھا جو زار و قطار نہ رو رہا ہو اور جو اپنی بساط سے زیادہ چندہ دینے پر آمادہ نہ ہو۔

سرسید نے قریہ قریہ، بستی بستی، گلی گلی، گھر گھر جا کر، جھولی پھیلا کر کالج کے لئے چندہ مانگا اور جب تک یہ مہم تکمیل تک نہیں پہنچی، نہ دن کو آرام سے بیٹھا، نہ رات کو چین سے سویا۔ یہ محض استعارہ نہیں، حقیقت ہے سرسید کے دستِ راست، نواب محسن الملک نے خود اپنا ایک واقعہ لکھا ہے جو اس حقیقت کی ایک زندہ شہادت ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ وہ تعلیمی کمیٹی کے اجلاس کے سلسلہ میں علی گڑھ گئے تو سرسید کے ہاں قیام کیا۔

رات کو سرسیدؒ نے میرا پلنگ بھی اپنے کمرے میں بچھوایا تھا۔ گیارہ بجے تک مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔ دو بجے کے قریب میری آنکھ کھل گئی تو میں نے سرسیدؒ کو اپنے پلنگ پر نہ پایا۔ میں انہیں دیکھنے کے لئے کمرے سے باہر نکلا، دیکھتا کیا ہوں کہ برآمدے میں ٹہل رہے ہیں اور زار و قطار روتے جاتے ہیں۔ میں نے گھبرا کر پوچھا کہ کیا خدانخواستہ کہیں سے کوئی افسوسناک

خیر آئی ہے؟ یہ سن کر اور زیادہ رونے لگے۔ اور کہا کہ اس سے زیادہ اور کیا مصیبت ہو سکتی ہے کہ مسلمان بگڑ گئے اور بگڑتے جا رہے ہیں۔ اور کوئی صورت ان کی بھلائی کی نظر نہیں آتی۔ میری ساری رات اسی ادھیڑبن میں گذری ہے کہ دیکھئے کہ کل جلسہ کا انجام کیا ہوتا ہے اور کسی کے کان پر جوں چلتی ہے یا نہیں۔

نواب محسن الملک کہتے ہیں کہ سرسیدؒ کی یہ حالت دیکھ کر جو کیفیت میرے دل پہ گذری اس کو بیان نہیں کر سکتا اور جو عظمت اس شخص کی اس دن سے میرے دل میں بیٹھی ہوئی ہے اس کو میں ہی جانتا ہوں۔

جوں جوں سرسید اپنے مشن میں کامیاب ہوتا جاتا تھا، مولوی صاحبان کی مخالفت شدید سے شدید تر ہوتی جاتی تھی۔ جب ان کے کفر کے فتوے اور جھوٹا پراپیگنڈہ کامیاب نہ ہوا تو انہوں نے اس کے خلاف ایک منظم عملی قدم اٹھایا اور علی گڑھ کالج کے بالمقابل ایک دارالعلوم (دیوبند) قائم کر دیا۔ علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ

دیوبند انگریزی شاہنشاہیت کی غیر ارادی تخلیق ہے۔

(سید نذیر نیازی - اقبالؒ کے حضور صـ ۲۸۲)

دیوبند کی طرف سے (من حیث الکل) تحریکِ پاکستان کی جس قدر مخالفت ہوئی۔ اس نے حضرت علامہؒ کے اس اندازہ کو تقویت پہنچا دی۔ حقیقت یہ ہے کہ علی گڑھ بھی ایک تحریک تھی اور دیوبند بھی ایک تحریک، اور ان دونوں کا تصادم آج تک چلا آ رہا ہے۔ اقبالؒ اور قائداعظم نے جب کہا تھا کہ پاکستان میں ملّا کریسی کا وجود نہیں ہو گا تو اس سے اس تحریک کا سدِ باب مقصود تھا۔ (تفصیل اس اجمال کی ذرا آگے چل کر سامنے آئیگی) ان حضرات کا پراپیگنڈہ یہ تھا کہ اس کالج سے مغرب زدہ، مادہ پرست، ملحد، بے دین، کرسٹان نوجوان نکلیں گے۔ اس کے برعکس، اس تعلیم سے سرسید کے پیشِ نظر کیا تھا، اس کا اندازہ ان کے ان چند فقروں سے لگایئے جن سے انہوں نے ایک دفعہ اپنے طلباء سے خطاب کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا۔

مسلمان طلباء

"یاد رکھو سب سے سچا کلمہ لا الٰہ الا اللّٰہ محمّد رسول اللّٰہ ہے اس پر یقین رکھنے کی بدولت ہماری قوم، ہماری قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے۔ پھر اگر تم آسمان کے ستارے بھی ہو گئے تو کیا؟ مجھے امید ہے کہ تم علم اور اسلام دونوں کے نمونے ہو گے اور جبھی ہماری قوم کو حقیقی عزت نصیب ہوگی"۔

سرسید کے زیرِ تربیت جو نوجوان اس کالج سے نکلے ان کے دل میں قوم کی محبت اور اسلام کا درد کس حد تک تھا۔ اس کے لئے ان کی زندگی کی عملی شہادت ہمارے سامنے ہے۔ لیکن ان میں ارکانِ اسلام کی ادائیگی کے سلسلہ میں ڈسپلن کا کیا عالم تھا اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایئے جسے صدقِ جدید (لکھنؤ) کے مدیر نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا:

اذان کی آواز پر

غالباً ۱۸۹۸ء کا ذکر ہے سرسیدؒ کی وفات یا تو ہو چکی تھی یا عنقریب ہونے کو تھی علی گڑھ کی شہرت کرکٹ کے میدان میں ہندوستان گیر ہو چکی تھی کہ ایک کرکٹ میچ سول سروس والوں کے مقابل نینی تال میں قرار پایا میچ شروع ہوا اور اتفاق سے جمعہ کا دن تھا اور سول سروس ٹیم کھیل رہی تھی علی گڑھ کے شہرۂ آفاق باؤلر اشفاق باؤلنگ کر رہے تھے بس ایک مرتبہ جو اشفاق نے گیند پھینکنے کیلئے ہاتھ اٹھایا کہ اسی سیکنڈ نمازِ جمعہ کی اذان کی آواز کان میں آئی اور معاً بلا توقف اس کا اٹھا ہوا ہاتھ نیچے گر گیا۔ اشفاق نے اتنا بھی نہ کیا کہ باؤلنگ ہی پوری کر لیتا۔ سول سروس والے اس پابندیٔ احکام پر عش عش کر اٹھے یہ تھے "بے دین اور نیچری" سرسیدؒ کی درسگاہ کے تعلیم و تربیت یافتہ نوجوان!

"اکال الامم"

مولانا حالیؒ نے بھارت کو "اکال الامم" کہا ہے یعنی قوموں کو کھا جانے والی ڈائن۔ بھارت کی ساری تاریخ کا خلاصہ اسی ایک فقرہ میں آ جاتا ہے۔ زمانۂ قبل از تاریخ سے اس ملک میں مختلف قومیں یکے بعد دیگرے آتی رہیں، لیکن اس نے انہیں اس طرح نگل لیا کہ ان کا جداگانہ تشخص تک کہیں نہیں ملتا۔ یہ عجیب بات ہے کہ انہوں نے ان کے مذہبی عقائد سے تعرض نہیں کیا۔ انہیں سیاسی طور پر اپنے اندر ضم کر لیا تو ان کے عقائد رفتہ رفتہ خود ہی ہندو مت کا جزو بن گئے۔ اصل یہ ہے کہ کوئی متعین طور پر کہہ ہی نہیں سکتا کہ ہندو دھرم ہے کیا۔ ان کے بڑے بڑے مورخ اور محقق ہندو دھرم کی تعریف (DEFINITION) بھی نہیں کر سکے۔ نہ ہی ہندو کو اس سے کوئی خاص دلچسپی ہوتی ہے۔ اسے اس سے غرض ہے کہ یہ سب اپنے آپ کو ہندو کہہ دیں۔ مسلمان اس باب میں سخت ہڈی ثابت ہوئی جو ان سے نگلی نہ جا سکی۔ یہ ہزار برس سے بھی زائد عرصہ سے یہاں رہ رہے تھے، لیکن انہوں نے اپنا جداگانہ تشخص برقرار رکھا۔ یہ بات ہندو کے سینے پر سانپ بن کر لوٹتی تھی۔ جنگِ آزادی کے بعد جو ان کی سلطنت چھنی اور ان کی جمعیت کا شیرازہ بکھرا، تو ہندو نے اسے اپنے مقصد کے حصول کے لئے سازگار سمجھا۔ ادھر انگریز کی بھی یہی کوشش تھی کہ مسلمانوں کا جداگانہ تشخص قائم نہ ہونے پائے۔ ان دونوں کی ملی بھگت نے اس خیال کو عام کرنا شروع کر دیا کہ ہندوستان میں ایک ہی قوم بستی ہے۔ سرسیدؒ نے اس خطرے کو بھی بھانپا اور ۱۸۶۷ء میں بنارس کے کمشنر مسٹر شیکسپیئر کے سوال کے جواب میں برملا کہا۔

مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ قومیں اب کسی کام میں بھی دل سے شریک نہیں ہو سکیں گی۔ ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ جوں جوں وقت گذرتا جائے گا، یہ مخالفت اور عناد ان ہندوؤں کے سبب سے ابھرے گا جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں۔ جو زندہ رہے گا، وہ دیکھے گا۔

انڈین نیشنل کانگریس

اس وقت یہ مسئلہ نظری سا تھا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد انہوں نے اس کی عملی تدبیر بھی سوچ لی۔ ۱۸۸۵ء میں ایک انگریز کے

ایسا یہ ایک ادارہ وجود میں لایا گیا جس کا نام انڈین نیشنل کانگریس رکھا گیا۔ خود اس نام کے اندر "انڈین نیشن" کا تصور موجود تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے تمام باشندوں کو اس میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی۔ یہ بظاہر بڑی معصوم سی سکیم تھی۔ لیکن اس مقام پر دکھائی دیتا ہے کہ سرسیّد کی نگاہ کسقدر دوررس تھی۔ میں تو جب بھی اس پر غور کرتا ہوں، بلاساختہ پکار اٹھتا ہوں کہ سرسیّد بلا شک اقوامِ عالم کے صفِ اوّل کے سیاستدانوں میں کھڑے ہونے کے مستحق ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو کھلے کھلے الفاظ میں متنبہ کیا کہ اس کانگریس کی تاسیس ایک فریب ہے، وہ اس کے دام میں ہرگز نہ پھنسیں اس سے یہ "اکال الامم ڈائن" تمہیں ہضم کر جائے گی۔ تمہارا جداگانہ تشخص مٹ جائے گا اور جب کسی قوم کا تشخص باقی نہ رہے تو اس کا کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ سرسیّد نے اس شدت اور تکرار سے خطرے کی یہ گھنٹی بجائی کہ قوم کے اربابِ دانش و بینش سوچنے پر مجبور ہو گئے اور ان میں سے معدودے چند کے سوا کسی نے اس کی طرف تعاون کا ہاتھ نہ بڑھایا۔ سرسیّد کا بویا ہوا یہی وہ بیج تھا جو اس کی

مسلم لیگ

وفات کے چند سال بعد (۱۹۰۶ء میں) مسلم لیگ کی شکل میں نمودار ہوا۔ یہ تھا وہ بطنِ جلیل جسے بجا طور پر پاکستان کا منبعِ اوّل کہا جائے گا۔ اس کی فراست و ذہانت اور جرأت و بسالت کا تو پوچھنا ہی کیا، اس کے ایثار اور اخلاص کا یہ عالم تھا کہ جب وہ فوت ہوا تو اس کے بکس میں سے پانچ روپے نکلے، اور اس کی تجہیز و تکفین کا انتظام اس کے دوستوں نے کیا۔ اس کی حمیت دینی کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ یوپی کے اس زمانے کے گورنر (سر ولیم میور) نے نبی اکرمؐ کی سیرت پر ایک کتاب لکھی تھی جس میں حضورؐ کی ذاتِ اقدس و اعظم پر ناروا حملے کئے تھے۔ سرسیّد نے اسے یہ ملا چیلنج دیا اور کہا دیکھو! میں تمہارے اعتراضات کی قلعی کسطرح کھولتا ہوں۔ اس نے لندن کے کتب خانوں میں بیٹھ کر اس کی کتاب کا جواب لکھا۔ کتاب مرتب ہو گئی تو اس کے چھپوانے کے لئے پیسے نہیں تھے۔ اس پر قریب چار ہزار روپے لاگت آتی تھی۔ اس نے اپنی کتابیں، گھر کا سامان، کھانے پینے کے برتن بیچ کر، قرض لے کر، اپنے گھر سے دوستوں سے بھیک مانگ کر بڑی مصیبت کے ساتھ یہ روپیہ فراہم کیا۔ اور اس کتاب کو چھپوایا۔ اسی زمانے میں نواب محسن الملک کو اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں!

> چاہے میں محتاج، فقیر بھیک مانگنے کے قابل ہو جاؤں، مگر کتاب ضرور چھپواؤں گا تاکہ جب قیامت کے دن میرا نام پکارا جائے تو خدا فرمائے کہ سیّد احمد کو بلاؤ جو اپنے نانا کے نام پر فقیر ہو گیا۔

یہ تھا سرسیّد ——— وہ، دل اور دماغ دونوں کا مومن ——— جس کے خلاف ہمارے علمائے کرام کفر و الحاد کے فتوے لگا رہے تھے، اور آج بھی جس کا نام سن کر ان کے

پیشانیوں پر بل پڑ جاتے ہیں۔

انگریزی کی اہمیت

میں نے سرسید کے دو عظیم کارناموں کا ذکر کیا ہے، ایک یہ کہ اس نے اس انگریزی تعلیم کے حاصل کرنے کا شوق اور جذبہ پیدا کیا جسے مولوی صاحبان نے حرام قرار دے رکھا تھا، اور دوسرے انہیں متنبہ کیا کہ وہ ہندو اور انگریز کے متحدہ قومیت کے بچھائے ہوئے جال کا شکار نہ ہو جائے۔ آیئے اب ان کی اہمیت پر ایک چھچلتی ہوئی نگاہ ڈالیں۔ ذرا سوچیئے کہ اگر مولانا حضرات کے فتووں سے مرعوب ہو کر مسلمان انگریزی تعلیم حاصل نہ کرتا تو ہندوستان میں اس کا حشر کیا ہوتا؟ بیسویں صدی کے آغاز سے لے کر اس وقت تک جو سیاسی نبرد آزمائیاں ہوتی چلی آئی ہیں، اگر مسلمان انگریزی زبان سے ناواقف اور اس کی رُو سے حاصل کردہ علومِ جدیدہ سے بے بہرہ ہوتا تو اس کا نتیجہ کیا نکلتا۔ مسلمانوں نے انگریز کا مقابلہ کیا اور ہندو کو پچھاڑا تو اسی زبان کے بل بوتے پر اس نے انگلستان کی پارلیمان میں اپنے دعاوی کی صداقت کو منوایا اور اقوامِ عالم سے اپنا تعارف کرایا۔ تو اسی زبان کے تصدق۔ آپ زمانہ قبل از پاکستان کے اقوامِ متحدہ کے ایوانات پر نظر ڈالئے۔ ان میں مسلمان مملکتوں کے نمائندے اکثر و بیشتر گونگے بن کر بیٹھے رہتے تھے۔ پاکستانی نمائندے وہاں پہنچے تو انہوں نے اپنی غلغلہ انداز تقریروں سے ان ایوانات کے در و دیوار تک کو ہلا دیا۔ ان کی یہی زباندانی تھی جس سے ان کے حصے میں مسلم اقوام کی لیڈرشپ آ سکی ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں ان کی قابلِ رشک مسابقت کو دیکھئے اور پھر نگاہ ڈالئے اس چھوٹے سے مدرسے پر جس کی بنیاد آج سے سو سال پہلے سرسیدؒ کے بابرکت ہاتھوں نے رکھی تھی۔ اور پھر یہ بھی سوچیئے کہ اگر سرسیدؒ مولانا حضرات کے فتووں کے سامنے سپر انداز ہو جاتا تو آج نہ پاکستان دنیا کے نقشے پر موجود ہوتا، نہ کوئی اقبالؒ اور جناحؒ کا نام تک جانتا۔ آپ نے غور فرمایا کہ سرسیدؒ کا مقام کیا ہے!

دیوبندی مخالفت

اب اگلے نقطہ کی طرف آیئے۔ جب سرسیدؒ نے ہندی مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ کی آواز بلند کی تو انہی مولانا حضرات، بالخصوص، اہلِ دیوبند، نے اس کی بھرپور مخالفت کی، اور اس کے خلاف کفر و الحاد کے فتوے صادر کئے۔ اور جب اقبالؒ اور جناحؒ نے ان کی آزاد مملکت کی آواز اٹھائی تو انہی حضرات نے، اسی طرح ان کے خلاف کفر و الحاد کے فتوے عائد کئے اور اس آواز کو دبانے کی بھرپور کوشش کی۔ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) نے قائداعظمؒ کو کافرِ اعظم کا خطاب دینے کے بعد فرمایا:

جو لوگ مسلمانوں کو کانگریس کے میدانِ سیاست میں اترنے سے روک رہے ہیں اور متحدہ قومیت کی بھیانک صورت ظاہر کر کے نفرت دلا رہے ہیں، بلاشک و شبہ برطانیہ کی ایسی عظیم الشان خدمات سرانجام دے رہے ہیں جو اس کی افواج اور اسلحہ سے بھی انجام نہیں پا سکتیں۔ (پمفلٹ متحدہ قومیت اور اسلام صفحہ ۷۶)

انہوں نے علامہ اقبالؒ کا نام لے کر کہا۔

غرضیکہ جادوگرانِ برطانیہ نے اپنی ساحرانہ کارگذاریوں سے سرسیدؒ جیسے تجربہ کار، عقلمند شخص کو نہ صرف متحدہ قومیت سے بلکہ پالیٹیکس اور آئینی جدوجہد سے بھی روکا، اور اس کے ذریعے مسلمانوں کو ہمیشہ سیاست سے الگ رکھو اکر بالکل نابلد اور ڈرپوک بنا دیا۔ پھر اگر ڈاکٹر اقبالؒ (مرحوم) اس سحر سے مسحور ہیں تو کیا تعجب! (ایضاً ۹)

ان حضرات نے جس جس انداز سے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی تھی، اس کے متعلق میں بڑی تفصیل سے لکھتا اور کہتا چلا آ رہا ہوں۔ ان کی یہ مخالفت تشکیلِ پاکستان کے بعد بھی کم نہیں ہوئی۔ اس نے صرف انداز دوسرا اختیار کر لیا ہے۔ انہوں نے اسلام اور شریعت کے نام پر قوم میں مسلسل انتشار پھیلا رکھا ہے۔ ان کی انتہائی کوشش یہ ہے کہ مسلمان ایک مرکز پر جمع نہ ہونے پائیں۔ قانون سازی کا کام ان کے ہاتھ میں آ گیا ہے۔ اربابِ اقتدار بالعموم دین کی تعلیم سے بے بہرہ ہیں۔ اس سے ان کی بن آئی ہے۔ یہ اس قسم کے قوانین وضع کئے چلے جا رہے ہیں جو قرآن مجید کے بھی خلاف ہیں اور علم و عقل کے بھی۔ یہ قوم کو شریعت کی فروعات میں اس طرح الجھائے چلے جا رہے ہیں کہ اسے دین کے اصولوں کے متعلق سوچنے کے لئے فرصت ہی نہ ملے۔

دین کیا تھا؟ دین نام تھا فطرت (نیچر) کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں اقدارِ خداوندی کیمطابق نوعِ انسان کی منفعت کے لئے صرف کرنے کا۔ دین نام تھا علم و عقل کی رُو سے قرآنی حقائق کو سمجھنے اور قوم کی حیاتِ اجتماعیہ کو ان کے قالب میں ڈھالنے کا۔ دین نام تھا اس مملکت کے قیام کا جو شہنشاہیت، آمریت، سرمایہ داری، مذہبی پیشوائیت کی انسانیت کش زنجیروں کو توڑ کر انسان کو صحیح آزادی سے ہمکنار کر اسکے۔ ان حضرات کی کوشش ہے کہ یہ دینی مملکت پاکستان میں۔ نہ صرف یہ کہ قائم نہ ہونے پائے بلکہ اس کا تصور بھی قوم کی نگاہوں سے اوجھل رہے۔ دین اور مذہب کی یہی کشمکش سرسیدؒ کے زمانے سے آج تک سرگرمِ عمل چلی آ رہی ہے۔ اس ستیزہ کاری میں سرسیدؒ کا کیا مقام تھا، اسے اقبالؒ ہی صحیح طور پر سمجھ سکتا تھا۔ سید نذیر نیازی (مرحوم) نے حضرت علامہؒ کی زندگی کے آخری تین ماہ (جنوری تا مارچ ۱۹۳۸ء) کے شب و روز کے کوائف کو ڈائری کی شکل میں قلمبند کر کے ـــــــــ اقبالؒ کے حضور ـــــــــ کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ اس میں علی گڑھ اور دیوبند کی کشمکش اور سرسیدؒ کی خدمات کے متعلق بڑی تفصیلی گفتگو یں درج ہیں۔ ایک مقام پر حضرت علامہؒ نے فرمایا تھا:

سرسیدؒ نے خوب سمجھ لیا تھا کہ ہندوستان کا سیاسی مسئلہ کیا ہے۔ سرسیدؒ کو علماء نے کیا کچھ نہیں کہا : کافر، ملحد کرسٹان ——— لیکن سرسیدؒ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ انہوں نے اس خطرے کو بھانپ لیا جو بحیثیت ایک قوم مسلمانوں کو درپیش تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کی جداگانہ قومیت پر زور دیا۔ وہ جب تعلیم پر زور دیتے، تہذیب وتمدن میں آگے بڑھنے کی تاکید کرتے، جب بھی ان کا کہنا یہی تھا کہ ہم اپنا جداگانہ ملّی وجود ہر حالت میں قائم رکھیں۔ (صفحہ ۲۹۳)

پھر ارشاد ہوا:

یہی وجہ ہے کہ علیگڑھ کی بدولت ایک عام بیداری پیدا ہوئی اور قوم کے قواسکے علم وعمل حرکت میں آئے۔ یہ گویا ہماری نشاۃ ثانیہ ہی کی ایک تحریک تھی۔

(صفحہ ۲۹۳)

دیوبندؒ[1] کی طرف سے اس زمانے میں بھی اس کی مخالفت ہوئی اور اس کے بعد جب علامہ اقبالؒ نے اسے دہرایا کہ مسلمان ایمان کے اشتراک کی بناء پر ایک جداگانہ مستقل قوم کی حیثیت رکھتے ہیں تو اس کی سب سے زیادہ شدید مخالفت دیوبند ہی کی طرف سے ہوئی۔ علامہ اقبالؒ کی زندگی کے آخری دنوں میں دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کے ساتھ ان کی معرکہ آرائی تحریک پاکستان کا نہایت اہم باب ہے۔ مولانا مدنیؒ متحدہ قومیت کو مطابقِ اسلام قرار دیتے تھے۔ تشکیلِ قومیت ہی نہیں، وہ نظامِ حکومت کے متعلق بھی کہتے تھے:۔

ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب شامل ہوں حاصل کرنے کے لئے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہیئے۔ ایسی مشترکہ آزادی، اسلام کے اصول کے عین مطابق ہے۔ (زم زم مورخہ ۷ جولائی ۱۹۳۸ء)

انہوں نے پھر بھی سیکولر ہی سہی، جمہوریت کی بات تو کی تھی۔ پاکستان میں اقامتِ دین کے مدعی اور بھی آگے بڑھ گئے، بلکہ یوں کہیئے کہ انتہا تک پہنچ گئے ہیں۔ کالعدم جماعت اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد نے ایک تقریب میں تقریر کرتے ہوئے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا:

سعودی عرب کے علاوہ کسی جگہ میں مکمل اسلامی نظام نافذ نہیں۔ سعودی عرب میں بھی بادشاہت ہے، لیکن وہاں دیوانی اور فوجداری مقدمات کے سلسلے میں شرعی قوانین نافذ ہیں۔ (جنگ لاہور ۱۶ جولائی ۱۹۸۳ء)

یعنی ان کے خیال میں شہنشاہیت میں بھی مکمل اسلامی نظام نافذ ہو سکتا ہے۔ میاں صاحب کا

---

[1] "دیوبند" کی اصطلاح علامت ہے قدامت پرست مذہبی پیشوائیت کی خواہ ان کا تعلق کسی فرقے اور کسی مسلک سے ہو۔

یہ تقویٰ کسی ہنگامی جذبہ کی تخلیق نہیں۔ اس کا پس منظر بہت دور تک چلا جاتا ہے۔ تشکیلِ پاکستان سے مقصود ایک ایسی مملکت کا قیام تھا جس میں علومِ سائنس کی زیادہ سے زیادہ ترویج ہو تاکہ اہلِ پاکستان دنیا کی زندہ قوموں کے (کم از کم) ہمدوش چلنے کے قابل ہو سکیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے زمامِ قیادت علماء کے ہاتھ میں رہنے کی بجائے انگریزی خواں طبقہ کے ہاتھ میں چلی جاتی تھی۔ طبقہ علماء کی طرف سے علومِ جدیدہ کی تحصیل کی مخالفت ان کے اسی جذبۂ رقابت کی پیدا کردہ ہے۔ ان کی انتہائی کوشش ہے کہ علومِ جدیدہ کی ہر روش کو شجرِ ممنوعہ بنا دیا جائے۔ فحاشی۔ بے حیائی، آبرو باختگی، بد اخلاقی، بے غیرتی، حمیت سوزی کے جملہ مظاہر کے واحد ذمہ دار مغربی علوم قرار دیئے جائیں۔ ہمارے نوجوان بد اخلاق ہوتے جا رہے ہیں، اس کی وجہ تعلیم مغربیت۔ ہماری لڑکیاں آزاد ہوتی جا رہی ہیں، اس کا سبب، کالج کی تعلیم۔ ہمارے طالب علم مذہب سے برگشتہ ہوتے جا رہے ہیں، اس کا باعث علوم سائنس کی ترویج۔ یعنی بلا تحقیق و تفتیش، ہر برائی اور ہر خرابی کی ذمہ دار انگریزی کی تعلیم۔ آپ نے دیکھا کہ یہ وہی بادسموم ہے جو سر سید کے زمانے میں ان حضرات کی ندامت گاہوں سے اٹھی تھی اور آج تک چلی جا رہی ہے۔

مملکت پاکستان اس لئے وجود میں لائی گئی تھی کہ اس میں قرآن کی حکمرانی ہو۔ قرآن کی حکمرانی سے ان حضرات کا وجود ختم ہو جاتا تھا۔ تشکیلِ پاکستان کے ساتھ ہی ان کی طرف سے کوشش شروع ہو گئی کہ یہاں کتاب اللہ کا اقتدار قائم نہ ہونے پائے۔ اس کی بجائے قوم کو "کتاب و سنت" کی ناممکن العمل اصطلاح میں الجھا دیا۔ بیس سال کے بعد کہا کہ کتاب و سنت نہیں، یہاں فقہ حنفی نافذ کر دی جائے۔ فقہ (حنفی ہو یا کوئی اور) ہمارے دورِ شاہنشاہیت میں وضع کردہ قوانین کا نام ہے۔ اس حربہ سے یہاں بالواسطہ نظامِ شاہنشاہیت کو زندہ کر دیا۔ اب رفتہ رفتہ اسے عین مطابق اسلام قرار دیا جا رہا ہے۔ فقہ کو، مملکت کا قانون قرار دینے سے، قانون سازی کا سارا اختیار مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں چلا گیا اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ ان کا دستِ نگر بن کر رہ گیا۔

یہ ہے وہ مقام جہاں قوم کو پہنچا دیا گیا ہے۔ اور جہاں سے نگاہیں کسی "سر سید"، کسی "اقبال" کسی "جناح" کی تلاش میں نکلتی ہیں اور بصد حسرت و یاس، یہ کہتی ہوئی کاشانۂ چشم میں لوٹ آتی ہیں کہ ؎

اے بندۂ مومن! تو کجائی، تو کجائی!!

باسمہ تعالیٰ

بادشاہت
آمریت
مغربی جمہوریت
غرضیکہ انسانوں کی کسی قسم کی حکومت بھی اسلامی نہیں کہلا سکتی۔
اسلامی حکومت صرف

اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا نام ہے

جس کا عملی ذریعہ اس کی
کتاب کی حکمرانی ہے۔

پرویز

بتقریب یومِ پاکستان

حکمرانی صرف کتاب اللہ کی جائز ہے

(وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

پرویز

کاروانِ انسانیت کی تاریخ، ناکام تجربات کی مسلسل داستان ہے۔ انسان ایک نظریہ وضع کرتا ہے اور اس پر تجربہ شروع کر دیتا ہے۔ صدیوں کی جانکاہ مشقتوں اور زہرہ گداز صعوبتوں۔ لرزہ انگیز خوں ریزیوں اور وحشت ناک فساد انگیزیوں۔ مہیب لڑائیوں اور تباہ کن جنگوں کے بعد یہ حقیقت اس کے سامنے آتی ہے کہ وہ نظریہ غلط تھا۔ اس کے بعد وہ اس کی جگہ ایک اور نظریہ وضع کرتا ہے' جو بالعموم سابقہ نظریہ کی ضد ہوتا ہے، اور اس پر تجربہ شروع کر دیتا ہے۔ وہ نظریہ بھی، اسی قسم کے فساد انگیز مراحل سے گذر کر ناکام ثابت ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی تمدّنی زندگی کی ابتدا سے لے کر آج تک اسی قسم کے عمل اور ردِّ عمل (ACTION AND RE-ACTION) تجارب سے گذر کر یہاں تک پہنچا ہے۔ ان نظریات اور تجربات کا تعلق اس کی زندگی کے ہر گوشے ——— معاشرت، معیشت، سیاست وغیرہ سے ہے۔ آج کی نشست میں ہم صرف اس کے سیاسی پہلو، اور وہ بھی اس کے ذیلی شعبے، اسلوبِ حکومت سے متعلق گفتگو کریں گے اور دیکھیں گے کہ وہ آج کس مقام پر کھڑا ہے اور اپنے مستقبل کے متعلق کیا سوچ رہا ہے۔

انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے بہرحال، مل جُل کر رہنا ہے۔ مل جُل کر رہنے کا لازمی نتیجہ ہے کہ افراد اور گروہوں کے باہمی مفاد میں ٹکراؤ ہو۔ ان میں تنازع ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ جن دو فریقوں میں باہمی تنازع ہو، وہ اسے از خود نہیں سلجھا سکتے۔ اس کے لئے کسی تیسرے فریق (ثالث) کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی سے حکومت کا تصور پیدا ہوا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ سب سے پہلے، انسان نے قبائلی زندگی اختیار کی جو خاندان ہی کی بڑھی ہوئی شکل کا نام تھا۔ اس ابتدائی زندگی میں قبیلہ کا بزرگ'

قبائلی زندگی

یعنی مورثِ اعلیٰ' واجب الاحترام سمجھا جاتا تھا اور اس کے فیصلے سب کے لئے واجب الاتباع تھے۔ یہ حکومت یا مملکت کا پہلا خاکہ تھا۔ اس میں عام طور پر مرد ہی سربراہ ہوتا تھا اگرچہ کہیں کہیں عورتیں بھی سربراہ نظر آتی ہیں۔

انسان کی ابتدائی زندگی میں (اور ابتدائی کیا، اب بھی جہاں جہاں جہالت ہے وہاں) پروہتوں (PRIESTS)

کو بہت بڑا مقام حاصل تھا۔ وہ فوق الفطرت قوتوں کے حامل اور دیوتاؤں کی اولاد یا ان کے نائب تصوّر کئے جاتے تھے۔ ہر شخص ان سے ڈرتا اور کانپتا تھا اور ان کے حکم کی خلاف ورزی کا تصوّر تک بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ان پروہتوں نے جب دیکھا کہ لوگ بزرگ خاندان (یا قبیلہ) کو اس لئے سربراہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے دل میں اس کا احترام ہوتا ہے، تو انہوں نے سوچا کہ لوگوں کے دل میں جو ان کا (پروہتوں کا) احترام ہے اس سے کیوں نہ فائدہ اٹھایا جائے۔ چنانچہ انہوں نے کہا (اور عوام سے منوا لیا) کہ درحقیقت

تھیا کریسی

حقِ حکومت الٰہی کو حاصل ہے۔ اس سے تھیا کریسی (مذہبی پیشواؤں کے لوہیاتی اختیارات) کے منہج حکومت کی طرح پڑی۔

کہیں ایسا بھی ہوا کہ کسی زور آور نے کسی طرح قوّت فراہم کر لی اور اپنے ساتھ اسی قسم کے اور شاہ زور افراد ملا لئے تو انہوں نے کمزور انسانوں کو دبانا شروع کر دیا۔ اس طرح حکومت بزورِ قوّت" کا انداز وجود میں آیا۔ اسے ملوکیت یا شاہنشاہیت کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا۔ ان اربابِ قوّت (راجاؤں ۔ بادشاہوں)

ملوکیت

نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ خالی قوّت کے بل بوتے پر لوگوں کو دبائے رکھنے میں خاصی دقتیں پیش آتی ہیں۔ قوّت کے ساتھ احترام یا عقیدت کا عنصر بھی شامل ہونا چاہیئے۔ دوسری طرف مذہبی پیشواؤں نے دیکھا کہ قوّت کے بغیر خالی عقیدت کے زور پر اقتدار قائم نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ اس باہمی ضرورت کے تحت، بادشاہوں اور مذہبی پیشواؤں (راجاؤں اور پروہتوں) نے باہمی سمجھوتا کر لیا۔ مذہبی پیشواؤں نے، راجہ کو ایشور کا اوتار' اور سلطان کو ظل اللہ علی الارض (زمین پر خدا کا سایہ) قرار دے دیا اور بادشاہوں نے کہا کہ انہیں یہ خدائی اختیارات، مذہبی پیشواؤں کی وساطت سے حاصل ہیں۔ عملی زندگی میں انہوں نے دوائرِ اقتدار بانٹ لئے۔

سیکولرازم

مذہبی دائرے میں حکمرانی مذہبی پیشواؤں کی تسلیم کر لی گئی اور دنیاوی معاملات میں، بادشاہوں کی۔ اسے سیکولر اندازِ حکومت کہا جاتا ہے۔

اس مختصر سی روداد سے ہم نے دیکھ لیا کہ اندازِ اسالیبِ حکومت کتنے ہی کیوں نہ بدلتے رہے ہوں، نظریہ شروع سے اخیر تک ایک ہی کار فرما رہا ہے۔ یعنی انسانوں کی انسانوں پر حکومت۔ اس نظریہ کے تابع، حکمرانوں کے ہاتھوں محکوم انسان جس وحشت و بربریت کا شکار ہوئے اور جن مظالم کا تختۂ مشق بنے، ان کے تصوّر سے خود انسانیت کی روح کانپ اٹھتی ہے۔ جب یہ بہیمیت اور درندگی انتہا تک پہنچ گئی تو مغرب کے بعض مفکرین کے دل میں اس کے خلاف ردِ عمل پیدا ہوا اور انہوں نے سوچا کہ اندازِ حکومت کچھ ایسا ہونا چاہیئے جس میں انسان کی حکومت انسان پر نہ ہو۔ ان کی فکر اس نتیجہ پر پہنچی کہ

نظریۂ میثاق

نظامِ حکومت لوگوں کے باہمی معاہدہ سے قائم ہونا چاہیئے۔ اسے نظریۂ میثاق (THEORY OF SOCIAL CONTRACT) کہا جاتا ہے۔ اس کی ابتدا مشہور مفکر، ہابز اور لاک سے ہوئی تھی لیکن چونکہ اس کی عملی تفاصیل روسو (ROUSSEAU--1712-1778) نے مرتب کی تھیں اس لئے ہم اس سرگزشت کو وہیں سے شروع

کرتے ہیں۔ اس نے کہا کہ ہر انسان چاہتا ہے کہ اس کی آزادی برقرار رہے لیکن مدنی زندگی میں یہ ناممکن ہو چکا ہے اس لئے اس کا علاج یہ ہے کہ تمام انسان مل کر اپنی اپنی انفرادیت کو اجتماعی معاشرہ میں جذب کردیں۔ اس طرح اس معاشرہ کے احکام کا اتباع ہر فرد کی اپنی ذات کا اتباع ہوگا اور کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محکوم نہیں ہوگا۔ اس اجتماعی معاشرہ کو روسو، اجتماعی ارادہ (GENERAL WILL) سے تعبیر کرتا ہے۔ اس نے کہا کہ ہر فرد کے "دو ارادے" ہوتے ہیں۔ ایک ذاتی اور ایک بہ حیثیتِ شہری ہونے کے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی وقت ایک فرد کے ان ارادوں میں ٹکراؤ ہوجائے۔ ایسی صورت میں ذاتی ارادے کو اجتماعی ارادے کے تابع رکھنا ہی عین آزادی ہے۔

الفاظ کی حد تک تو یہ نظریہ بڑا خوش آئند بلکہ دلکش تھا لیکن اس کے بعد جب اس کی عملی تفسیر کا مسئلہ سامنے آیا تو اس میں دشواری پیدا ہوئی۔ مسئلہ یہ سامنے آیا کہ اس "اجتماعی ارادے" کا تعین کس طرح کیا جائے؟ اس کے جواب میں روسو نے کہا کہ اس کے لئے ہر فردِ معاشرہ کی رائے دریافت کی جائے۔ لیکن یہ کہنے کے بعد اسے خود ہی خیال آیا کہ ایک مملکت کے تمام افراد کی آراء کا معلوم کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوگا۔ تو پھر کیا کیا جائے؟ اس کے لئے اس نے لاک کے نظریہ کا سہارا لیا جس نے کہا تھا کہ حکومت، افراد کے نمائندگان پر مشتمل ہونی چاہیئے اور اگر ان نمائندوں میں کبھی اختلاف ہوجائے تو فیصلہ اکثریت کی رائے کے مطابق ہونا چاہیئے۔ روسو اور لاک کے نظریات کے اس امتزاج کو قبول کر لیا گیا اور اس کے مطابق اسلوبِ حکومت کو ڈیماکریسی کہہ کر پکارا گیا۔ اس کا ترجمہ جمہوریت کیا جاتا ہے۔

ڈیماکریسی

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ ڈیماکریسی کی بنیاد حسبِ ذیل مفروضات پر قائم ہوتی ہے:۔

(۱) اس اندازِ حکومت میں حاکم اور محکوم کا امتیاز نہیں رہتا۔ اس میں عوام خود اپنی حکومت آپ قائم کرتے ہیں۔

(۲) عوام کا منشا ان کے نمائندگان کے ذریعے معلوم ہوسکتا ہے۔

(۳) کسی فیصلے کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار ان نمائندگان کی اکثریتِ رائے ہوتا ہے۔ اور

(۴) اقلیت کو اکثریت کے فیصلے صحیح تسلیم کرنے پڑتے ہیں اور تمام افرادِ مملکت پر ان کی اطاعت لازمی ہوتی ہے۔

شخصی حکومتوں کے ڈسے ہوئے مظلوم انسانوں نے اس نظریہ کو آیۂ رحمت سمجھا۔ اس کی شان میں مدح و ستائش کے قصائد نشید ہوئے۔ اس کے نفاذ پر مسرت اور شادمانی کے جشن منائے گئے۔ انسانیت نے سمجھ لیا کہ اس نے آزادی کے فردوسِ گم گشتہ کو پھر سے پا لیا ہے۔ اس کا شہرہ مغرب تک ہی محدود نہ رہا۔ اطرافِ عالم میں اس پر تبریک و تہنیت کے پھول برسائے گئے۔ دنیا کی قریب قریب ہر قوم نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ جمہوریت۔ جمہوریت۔ جمہوریت کے نعروں سے کرۂ ارض گونج اٹھا۔ جس نے اس اندازِ حکومت کو اختیار نہ کیا، یا اس کی مخالفت کی آہ بھی، اسے انسانیت کا دشمن قرار دیا گیا۔

(۰)

لیکن اس غلغلے اور طنطنے کی ہنوز صدائے بازگشت بھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ اُسی مغرب سے اس قسم کی آوازیں بلند ہونی شروع ہو گئیں کہ یہ نظریہ بڑا فریب انگیز ہے۔ اسے نافذ کیا گیا تھا یہ کہہ کر کہ اس سے انسانوں پر انسانوں کی حکومت ختم ہو جائے گی لیکن ہوا یہ کہ اس سے انسانوں پر انسانوں کی حکومت پہلے سے بھی زیادہ شدّت کے ساتھ مسلط ہو گئی، اس فرق کے ساتھ کہ عہدِ جاہلیت میں حکمران بے نقاب سامنے آتے تھے۔

جمہوریّت کے خلاف

اب اس دورِ تہذیب میں وہ جمہوریّت کا نقاب اوڑھ کر آتے ہیں اور عوام کو اس فریب میں مبتلا رکھتے ہیں کہ تم پر کوئی اور حکومت نہیں کر رہا۔ یہ تمہاری اپنی حکومت ہے۔ تم اپنے آپ پر خود حکومت کرتے ہو۔

لندن یونیورسٹی کے پروفیسر (ALFRED COBBAN) نے (CRISIS OF CIVILISATION) کے نام سے ایک بلند پایہ کتاب شائع کی تھی جس میں اس نے تہذیبِ مغرب کے زوال کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس کی تباہی کا بڑا سبب، انداز جمہوریّت ہے۔ اس نے کہا تھا:۔

> اس نظریہ کو اگر بنظرِ امعان دیکھا جائے تو "عوام کے اقتدارِ اعلیٰ" کا فریب نکھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ اگر سیاست کو نظری حیثیت سے نہیں، بلکہ عملی حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ حاکم اور محکوم کو ایک ہی آ... در کرنا عملی ناممکنات سے ہے۔ عملاً حکومت افراد کے ایک طبقے پر مشتمل ہوتی ہے اور رعایا' افراد کے دوسرے طبقے کا نام ہوتا ہے۔ جب معاشرہ اپنی قبائلی زندگی سے ذرا آگے بڑھ جائے تو پھر حاکم اور محکوم کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ یہ سمجھ لینا کہ دونوں ایک ہی ہیں، مملکت کو لامتناہی اختیارات کا حامل بنا دیتا ہے۔ (ص ۶۸)

اس نظریہ کے متعلق کہ اکثریت جسے صحیح کہہ دے' وہ صحیح ہوتا ہے' پروفیسر مذکور لکھتا ہے:۔

> عوام کے اقتدارِ اعلیٰ کے نظریہ کی تائید میں روایتی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ حکومت یا تو قوت سے قائم کی جائے گی یا باہمی رضامندی سے۔ اور چونکہ یہ غلط ہے کہ جس چیز کو قوت صحیح کہہ دے وہ بالضرور صحیح ہو، اس لئے یہی درست ہے کہ حکومت کو باہمی رضامندی پر مبنی ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ دلیل نہ تو منطقی طور پر صحیح ہے، نہ ہی صداقت پر مبنی۔ اگر کسی بات کو لاکھ آدمی بھی صحیح کہہ دیں تو وہ (محض اس لئے کہ اتنے لوگوں نے اسے صحیح کہہ دیا ہے) صحیح نہیں ہو سکتی..... فیصلہ وہی صحیح ہو سکتا ہے جو در حقیقت صحیح ہو، نہ کہ وہ جسے زیادہ لوگ صحیح کہنا شروع کر دیں۔ روسو کہتا ہے کہ "منشائے عمومی ہمیشہ صحیح ہوگا" ورنہ وہ منشائے عمومی کہلا نہیں سکے گا۔ لیکن اگر یہ نظریہ صحیح ہے کہ صحیح وہی ہو سکتا ہے جو در حقیقت صحیح ہو۔ تو پھر اکثریت اور اقلیت کا سوال باقی نہ رہا۔ سوال یہ رہ گیا کہ جو چیز اخلاقی بنیادوں پر درست ہے، وہی صداقت ہے۔ (ص ۷۶)

اس کے بعد وہ لکھتا ہے:۔

> اقتدارِ اعلیٰ لفظی طور پر بڑا بلند آہنگ تصوّر ہے لیکن اس کا صحیح مفہوم صرف اس صورت میں سمجھ میں

> آسکتا ہے جب ہم یہ دیکھیں کہ روزمرہ کی زبان میں اس کا مطلب کیا ہے؟ اقتدارِ اعلیٰ سے مفہوم "اختیاراتِ مطلقہ" ہے۔ یعنی بلا حدود و قیود حکومت، خواہ ایسی حکومت ایک فرد کی ہو یا ایک جماعت کی۔ بنابریں "اقتدارِ اعلیٰ" کے نظریہ کو محض ایک نظری سوال سمجھ کر نظر انداز نہیں کر دینا چاہیئے۔ آج اسی مفروضہ کو حقیقتِ ثابتہ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ قوم کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہے، اور اس کے بعد بحث صرف اس مسئلہ کے متعلق رہ جاتی ہے کہ اختیارات کسی فردِ واحد کے ہاتھ میں ہونے چاہیئیں یا کسی نمائندہ جماعت کے ہاتھ میں۔ لیکن ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ "اقتدارِ اعلیٰ" کا یہ تصور صحیح بھی ہے یا نہیں۔ یہ ہے اصل مسئلہ۔ یعنی یہ مسئلہ کہ قانون کا سرچشمہ عوام کا منشاء ہے یا اس کے علاوہ کوئی اور سرچشمہ ہے۔ (ص۵۵)

اس اقتباس کو ذرا غور سے پڑھیئے کیونکہ اس میں ایسے اصولی نکات پیش کئے گئے ہیں جن کی اہمیت اس وقت سامنے آئے گی جب ہم جمہوریت کا تجزیہ قرآن مجید کی روشنی میں کریں گے۔

کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر (A.C. EWING) نے اپنی کتاب (INDIVIDUAL-THE STATE AND WORLD GOVERNMENT) میں ڈیماکریسی کے متعلق بڑی شرح و بسط سے بحث کی ہے۔ اس بحث کے دوران وہ لکھتا ہے کہ روسو نے یہ سمجھا تھا کہ جمہوری نظام میں استبداد یا غصبِ حقوق کا خطرہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ لوگ اپنے اوپر استبداد، یا خود اپنے حقوق کا غصب کبھی روا نہ رکھیں گے۔ لیکن

> اگر روسو، عصرِ حاضر میں جمہوری نظام کے عملی تجربہ سے پہلے اپنی کتاب نہ لکھتا تو وہ نظامِ جمہوریت کے متعلق کبھی اس خوش فہمی سے کام نہ لیتا۔ (ص۱۱۶)

پروفیسر جوڈ (C.M. JOAD) کو بھی، جو پہلے نظامِ جمہوری کا بڑا حامی تھا، بعد میں یہ کہنا پڑا کہ

> سائنس (یعنی مادی نقطۂ نگاہ سے) ہر چیز کی قیمت اس کی کمیت (QUANTITY) کے لحاظ سے مقرر ہوتی ہے، کیفیت (QUALITY) کی رو سے نہیں۔ سائنس کے عام ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسی اصول کو سیاست پر بھی منطبق کر لیا گیا۔ چنانچہ جمہوری اندازِ حکومت میں فیصلے "سروں کی گنتی" سے ہونے لگے۔ ہر سر ایک ووٹ، خواہ ایک سر مفکر کا ہو اور دوسرا گدھے کا ہی کیوں نہ ہو۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے:۔
>
> کہ از مغز دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید (DECADENCE)

مشہور فرانسیسی مفکر (RENE GUENN) لکھتا ہے:۔

فریبِ جمہوریت

> اگر لفظِ جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ لوگ خود اپنی حکومت آپ قائم کریں تو یہ ایک ایسی چیز کا بیان ہے جس کا وجود ناممکنات سے ہے اور جو نہ کبھی پہلے وجود میں آئی ہے اور نہ آج کہیں موجود ہے۔ ایسا کہنا ہی جمع بین النقیضین ہے کہ ایک ہی قوم بیک وقت حاکم بھی ہو اور محکوم بھی...... حاکم اور محکوم کا

تعلق دو الگ الگ عناصر کے وجود کا مقتضی ہے۔ اگر حاکم نہیں تو محکوم بھی نہیں۔ ہماری موجودہ دنیا میں جو لوگ کسی نہ کسی طرح قوت اور اقتدار حاصل کر لیتے ہیں ان کی سب سے بڑی قابلیت اس میں ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دل میں یہ عقیدہ پیوست کر دیں کہ (ان پر کوئی حاکم نہیں بلکہ) وہ خود اپنے آپ پر حاکم ہیں ...... عام رائے دہندگی کا اصول اسی فریب دہی کی خاطر وضع کیا گیا ہے۔ (اس اصول کی رو سے سمجھا یہ جاتا ہے کہ قانون اکثریت کی مرضی سے وضع ہوتا ہے اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اکثریت کی یہ مرضی ایک ایسی شے ہے جسے نہایت آسانی سے ایک خاص رُخ پر لگایا بھی جا سکتا ہے اور بدلا بھی جا سکتا۔

(CRISIS OF THE MODERN WORLD -- P. 106)

ڈین انگے (DEAN INGE) نے اپنی کتاب (THE FALL OF IDOLS) میں ڈیماکریسی کے خلاف، مختلف مفکرین اور مدبرین کے اقوال نقل کئے ہیں۔ ایک اقتباس ہے:۔

آزاد لوگ جنگ کے زیادہ متمنی ہوتے ہیں اور جمہوریتیں، مطلق العنان بادشاہوں سے بھی زیادہ اپنے جذبات کی غلام۔ (MIRABEAU)

ایک اور:۔

جمہوریت نظری طور پر تو اپنے آپ کو مثالی نظام محسوس کر سکتی ہے لیکن عملی طور پر یہ ایک ناممکن نظریہ ہے۔ (IRVING BABBIT)

اور خود انگے کی اپنی رائے یہ ہے کہ

ایک مکمل جمہوریت بھی اس حد تک جمہوری نہیں ہو سکتی جس حد تک یہ نظریہ جمہوریت اسے جمہوری بناتا ہے۔ (ص ۱۱)

۱۹۴۷ء میں، اقوام متحدہ کی ثقافتی مجلس (UNESCO) نے ایک تحقیقاتی کمیٹی اس غرض سے منعقد کی تھی کہ وہ جمہوری نظام حکومت کے متعلق سائنٹیفک انداز سے چھان بین کرے۔ اس کمیٹی نے دنیا بھر کے مفکرین اور مدبرین سے جمہوریت سے متعلق مقالات حاصل کئے اور انہیں ایک کتابی شکل میں شائع کرایا۔ اس کا نام ہے۔ (DEMOCRACY IN A WORLD OF TENSION) اس کمیٹی نے سب سے پہلے یہ سوال پیش کیا تھا کہ جمہوریت کا مفہوم کیا ہے؟ جوابات کی اکثریت میں اعتراف کیا گیا تھا کہ یہ اصطلاح بالکل مبہم (AMBIGUOUS) ہے۔ آج تک اس کا مفہوم ہی متعین نہیں ہو سکا۔ اس کے بعد کمیٹی نے دوسرا سوال پیش کیا کہ "کیا اکثریت کا فیصلہ ہمیشہ درست ہوتا ہے اور اس کے خلاف احتجاج کرنا جمہوریت کے خلاف ہے؟" اس کے جواب میں کہا گیا کہ "یہ سمجھنا غلط ہے کہ اکثریت کا فیصلہ غلطی سے پاک ہوتا ہے۔ وہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے اقلیت کو حق حاصل ہے کہ وہ اکثریت کے فیصلے کے خلاف ایجی ٹیشن کرے اور اسے بدلوا دے۔"

یہ ہیں جمہوریت کے متعلق دورِ حاضر کے مفکرین اور مدبرین کے خیالات۔ میں نے یہاں اختصار سے

کام لیا ہے۔ جو حضرات تفصیل میں جانا چاہیں، وہ میری کتاب "انسان نے کیا سوچا؟" میں "سیاست" کا باب ملاحظہ فرمالیں۔

(۰)

سوال یہ ہے کہ جمہوریت کو مسترد کرنے کے بعد، یہ مفکرین کس قسم کا نظام چاہتے ہیں؟ اس باب میں بنیادی

اقتدار اعلیٰ

اور متفق علیہ حقیقت یہ ہے کہ لوگ، انسانوں کے ہاتھ میں اقتدار دینے کے یکسر خلاف ہیں، خواہ اس کی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ فرانسیسی مفکر (BERTAND DE JOUVENEI) نے ایک اعلیٰ پایہ کی کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے (SOVEREIGNTY) وہ اس میں لکھتا ہے:۔

یہ ادنیٰ تعمق یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اگر آپ، ایک دفعہ اس اصول کو تسلیم کرلیں کہ انسانی مرضی اور ارادے کو اقتدارِ مطلق حاصل ہو سکتا ہے تو اس کے بعد جو نظامِ حکومت بھی قائم ہوں گے، حقیقت کے اعتبار سے وہ سب ایک جیسے ہوں گے۔ نظامِ ملوکیت اور جمہوری نظام بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن اس اصول کی رُو سے دونوں کا شعوری قالب ایک ہی ہوتا ہے۔ جس کے ہاتھ میں اقتدار ہو یہ اصول اسے یکساں حقِ مطلق انسانی عطا کر دیتا ہے۔ (صـــ ۱۹۹)

ان کا مطالبہ یہ ہے کہ حکومت انسانوں کی نہیں، قانون کی ہونی چاہیئے۔ اس کے بعد ان کے ہاں بحث یہ چل

حکومت قانون کی

رہی ہے کہ وہ قانون کس قسم کا ہونا چاہیئے؟ اس حقیقت کو امریکی ماہرِ آئین ایڈورڈ کارون، اپنی کتاب (THE HIGHER LAW) میں بڑی وضاحت سے سامنے لاتا ہے۔ وہ اس میں مشہور مقنن (CICRO) کے یہ الفاظ نقل کرتا ہے:۔

حقیقی قانون مبنی بر حکمت اور فطرت سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ یہ فضا میں ہر جگہ پھیلا ہوا، غیر متبدل اور ابدی ہوتا ہے۔ یہ قانون معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے روکتا ہے۔ یہ مملکت کا فریضہ ہے کہ کوئی ایسا قانون نافذ نہ کرے جو اس قانون کے خلاف ہو۔ اسے اس کا بھی حق حاصل نہیں کہ وہ اس میں کسی قسم کی ترمیم کرے۔ نہ ہی وہ اسے منسوخ کرسکتی ہے۔ نہ ہماری پارلیمان اور نہ ہی سینیٹ کو اس کا اختیار ہے کہ وہ لوگوں کو اس قانون کی قید سے آزاد کردے ...... نہ ہی اس قانون کی کیفیت یہ ہے کہ روما کے لئے الگ قانون ہو اور ایتھنز کے لئے الگ — ایک قانون آج ہو اور دوسرا کل۔ یہ ایک ازلی غیر متبدل قانون ہے جو ابدی طور پر تمام اقوام کو اپنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہے۔ (صـــ ۱)

مشہور اطالوی مدبر میزینی (MAZZINI) اس باب میں اور بھی وضاحت سے لکھتا ہے:۔

اس میں شبہ نہیں کہ عام رائے دہندگی کا اصول بہت اچھی چیز ہے۔ یہی وہ قانونی طریق کار ہے جس سے ایک قوم تباہی کے مسلسل خطرات سے محفوظ رہ کر اپنی حکومت آپ قائم کرسکتی ہے۔ لیکن

قانون کیسا ہو؟

ایک ایسی قوم میں جس میں وحدتِ عقائد نہ ہو جمہوریت اس سے زیادہ اور کیا کرسکتی ہے کہ وہ اکثریت کے مفاد کی نمائندگی کرے اور اقلیت کو مغلوب رکھے۔ ہم یا تو خدا کے بندے بن سکتے ہیں یا انسان کے۔ وہ ایک انسان ہو (ملوکیت۔ آمریت)

یا زیادہ انسان (جمہوریت) بات ایک ہی ہے۔ اگر انسانوں کے اوپر کوئی اقتدارِ اعلیٰ نہ ہو تو پھر کونسی چیز ایسی رہ جاتی ہے جو ہمیں طاقتور افراد کے تغلّب سے محفوظ رکھ سکے؟ اگر ہمارے پاس کوئی ایسا مطلق اور ناقابلِ تغیر قانون نہ ہو، جو انسانوں کا وضع کردہ نہ ہو، تو ہمارے پاس وہ کونسی میزان رہ جاتی ہے جس سے ہم یہ پرکھ سکیں کہ فلاں کام یا فیصلہ عدل پر مبنی ہے یا نہیں۔ خدا کے علاوہ جو کبھی حکومت قائم ہو اس میں نتائج کی حقیقت ایک ہی رہتی ہے، خواہ اس کا نام لوناپارٹ رکھ لیا جائے، خواہ انقلاب۔ اگر خدا درمیان میں نہ رہے تو اپنے زمانہ سطوت میں ہر ایک مستبد بن جائے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یاد رکھئے کہ جب تک کوئی حکومت خدا کے قوانین کے مطابق نہیں چلتی، اس کا کوئی حق مسلّم نہیں۔ حکومت نوشتائے خداوندی کی ترویج و تنفیذ کے لئے ہے۔ اگر وہ اپنے اس فریضہ کی سرانجام دہی میں قاصر ہے تو تمہارا یہ حق ہی نہیں بلکہ فریضہ ہے کہ ایسی حکومت کو بدل ڈالو۔

(QUOTED BY GRIFFITH – IN –
–INTERPRETATERS OF MAN – P.P. 46–47)

اس قانون کو ابدی اور غیر متبدل کہنے کے ساتھ ہی ان مفکّرین نے یہ بھی واضح کر دیا کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسانی زندگی پابجولاں یا محبوس ہو کر رہ جائے۔ انہوں نے اس امر کی وضاحت کر دی کہ یہ قوانین یا اصول تو بے شک غیر متبدل رہیں گے لیکن ان پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق (جنہیں وہ قانون کی تعبیرات کہہ کر پکارتے ہیں) حالات کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہیں گے۔ وائٹ ہیڈ (جس کا انتقال کچھ ہی عرصہ پہلے ہوا ہے) ہمارے زمانے کا بہت بڑا مفکّر تھا۔ وہ اس باب میں لکھتا ہے:-

زندگی کو مستقل طور پر ایک ہی قالب میں محبوس رکھنا ناممکن ہے۔ اس لئے مذہب کو بھی سائنس کی طرح بدلتے تقاضوں کا لحاظ رکھنا پڑے گا۔ اس کے اصول ابدی ہوں گے لیکن ان اصولوں کی تعبیرات حالات کے ساتھ بدلتی رہیں گی۔

(SCIENCE AND THE MODERN WORLD – PP. 218–19)

آپ ان اقتباسات سے یونہی آگے نہ بڑھ جائیے۔ انہیں نگاہ میں رکھئے کیونکہ جب آگے چل کر قرآنی تجزیہ آپ کے سامنے آئے گا تو اس وقت ان کی اہمیت واضح ہوگی۔

ممتاز مغربی مفکّر (ERNEST BARKER) میزینی کی ہم نوائی میں کہتا ہے:-

مملکت کے ساتھ میری وفاشعاری ان اقدار کے تابع ہے جن کے تحفّظ کے لئے مملکت کا وجود عمل میں آیا ہے۔ اگر مملکت ان اقدار کی وفاشعار نہیں رہتی تو انہی اقدار کے تقاضا کی رُو سے میں مجبور ہو جاتا ہوں کہ اپنی وفاشعاری کو عدم وفاشعاری میں بدل دوں اور اس طرح ایک خوشگوار فرماں پذیری کے بجائے، بادلِ ناخواستہ مزاحمت کی روش اختیار کر لوں۔ (صفحہ ۱۹۵)

مملکت کی اطاعت

حقیقت یہ ہے کہ یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ مملکت ایسے معاہدہ کا بنیادی حق رکھتی ہے جس کی رُو سے اس کی اطاعت ہم پر بہرحال واجب

ہو۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ مملکت عدل کی مظہر اور اسے عمل میں لانے کا ذریعہ ہے۔ ہم پر مملکت کے ارباب اختیارات کے احکامات کی پابندی اس لئے لازم ہوتی ہے کہ مملکت عدل قائم کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اگر مملکت ایسی نہیں رہتی تو اس کے ساتھ ہماری وفا شعاری اور اطاعت ختم ہو جاتی ہے۔

آگے چل کر وہ لکھتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سیاسی اطاعت کا وجوب مشروط ہوتا ہے مطلق نہیں ہوتا۔ یہ اطاعت ہر حالت میں واجب نہیں ہوتی۔ یہ اس وقت تک واجب رہتی ہے جب تک یہ حق کسی بلند تقاضے کے ساتھ نہ ٹکرائے۔

PRINCIPLES OF SOCIAL & POLITICAL THEORY — PP. 193; 195; 220.

یہاں آپ نے دیکھا کہ ان مفکرین کے نزدیک حقِ حکومت نہ فرد کو حاصل ہے نہ اکثریت کو۔ حکمرانی صرف اقدار کی مطلوب و مقصود ہوتی ہے۔ ان اقدار میں عدل کا تقاضا سرِفہرست ہے۔ مغربی جمہوریت کی رُو سے اگر کسی متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ مملکت کے رائج الوقت قانون کے مطابق کر دیا جائے، تو اسے مطابقِ عدل کہا جائے گا۔ لیکن اب یہ مفکرین کہتے ہیں کہ دیکھنا یہ چاہیئے کہ وہ قانون کس قسم کا ہے جس کے مطابق فیصلہ کیا جا رہا ہے۔ اگر وہ قانون انسانوں کا وضع کردہ ہے تو اس کی رُو سے فیصلہ مبنی بر عدل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

عدل کا مفہوم

(EMIL BRUNNER) ہمارے دور کا فلسفۂ قانون کا بہت بڑا ماہر ہے۔ وہ اس باب میں لکھتا ہے:-

جو شخص فی الواقعہ سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ فلاں بات مبنی بر عدل اور فلاں ظلم پہ مبنی ہے وہ درحقیقت کہتا یہ ہے کہ عدل اور ظلم کے ماپنے کا ایک ایسا پیمانہ ہے جو تمام انسانی قوانین، معاہدات، رسوم و رواج سے ماورا ہے۔ وہ ایک ایسا معیار ہے جس سے تمام انسانی معیار ماپے اور پرکھے جا سکتے ہیں۔ یا تو اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ عدل کے لئے اس قسم کا مطلق الوہیاتی (خداوندی) معیار موجود ہے، ورنہ اس لفظ کا مفہوم انفرادی بن کر رہ جائے گا جو ایک کے نزدیک قابلِ قبول ہوگا اور دوسرے کے نزدیک ناقابلِ قبول۔ عدل کے لفظ سے مفہوم یا تو خداوندی فیصلہ ہوگا جس کے ساتھ حقِ مطلق (الحق) ہونے کی تقدیس شامل ہوگی اور یا پھر یہ محض چھوٹے لوگوں کی مینا کاری اور ملمع سازی ہوگی۔

(JUSTICE AND THE SOCIAL ORDER.)

سوال یہ ہے کہ اس قسم کا قانون ملے گا کہاں سے؟ اس کا جواب کسی "مذہب پرست" شخص کی زبان سے نہیں عصرِ حاضر کے بلند ترین سائنسدان آئن سٹائن کی زبان سے سنیئے۔ اس نے اپنی عمر کے آخری حصہ میں ایک کتاب شائع کی تھی جس کا نام ہی (OUT OF MY LATER DAYS) ہے۔ وہ اس میں لکھتا ہے:-

سائنس صرف یہ بتا سکتی ہے کہ "کیا ہے" وہ یہ نہیں بتا سکتی کہ "کیا ہونا چاہیئے"۔ اس لئے اقدار کا متعین کرنا اس کے دائرے سے باہر ہے۔ سائنس کے علمبرداروں نے اکثر اوقات اس امر کی کوشش کی ہے کہ وہ،

سائنس کی رو سے اقدار کے متعلق قطعی فیصلہ نافذ کر دیں۔ (یہ ان کی غلطی ہے جس کی وجہ سے) وہ مذہب کے خلاف محاذ قائم کر بیٹھے ہیں۔ سائنس کے نزدیک بس ایک "شے" ہوتی ہے۔ اس کی دنیا میں آرزو۔ اقدار۔ خیر و شر۔ نصب العینِ حیات۔ کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ سائنس نہ تو اقدار متعین اور قائم کر سکتی ہے اور نہ ہی انسانی سینے کے اندر داخل ہو سکتی ہے۔

آگے چل کر یہ سائنس دان کہتا ہے:-

وحی پر مبنی

یہ اقدار تجربات کے بعد وضع نہیں ہوتیں۔ یہ مقدس ہستیوں کی وساطت سے بذریعہ وحی ملتی ہیں۔ ان کی بنیادیں عقل پر نہیں ہوتیں۔ لیکن وہ تجربہ کی کسوٹی پر بالکل پوری اترتی ہیں اس لئے کہ صداقت کہتے ہی اسے ہیں جو تجربہ سے درست ثابت ہو۔

اور اسی پایہ کا ایک اور عالم طبیعیات ایڈنگٹن، اپنی کتاب (SCIENCE & THE UNSEEN WORLD) میں لکھتا ہے:-

اصل سوال خدا کی ہستی کا نہیں بلکہ اس امر کا یقین ہے کہ خدا بذریعہ وحی انسانوں کی راہ نمائی کرتا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ مغربی مفکر اور مدبر، جمہوریت کے عواقب سے تنگ آکر اب کس قسم کے نظام کے لئے مضطرب و بیتاب ہیں۔ اس نظام کے لئے جس میں اطاعت کسی انسان کی نہ ہو۔ اطاعت صرف قوانین کی ہو۔ یہ قوانین کس قسم کے ہونے چاہئیں، اس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں گذر چکی ہے۔ لیکن چونکہ آگے بات انہی قوانین کے حوالے سے چلتی ہے اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ جو کچھ انہوں نے کہا ہے اسے مختصر الفاظ میں سمٹا کر دہرا دیا جائے۔

۱- وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ صحیح نظام حکومت وہی ہو سکتا ہے جس میں انسانوں کا اقتدار نہ ہو بلکہ قانون کی حکمرانی ہو۔

۲- یہ قانون ابدی، غیر متبدل، زمان و مکان کی حدود سے ماوراء، عالم گیر ہو۔

۳- کسی حکومت کو اس کا اختیار نہ ہو کہ اسے منسوخ کرنا تو ایک طرف، اس میں ترمیم بھی کر سکے۔

۴- یہ قانون خدا کا متعین کردہ ہو اور وحی کے ذریعے انسانوں کو ملا ہو۔

۵- اس کے اصول و حدود تو غیر متبدل ہوں لیکن اس کے نفاذ کے طور طریق زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہیں۔

یہ ہے وہ نظام جس کا عکس یہ مفکر (سویڈن کے مشہور ماہر اقتصادیات۔ مرڈل کے الفاظ میں) "اپنی روح کے نشیمن میں دیکھ رہے ہیں" اور جسے لباسِ مجاز میں دیکھنے کے لئے ان کی نگاہیں بیتاب ہیں۔

——(○)——

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مفکر (کم و بیش سب کے سب) عیسائی ہیں اور وحی کے قائل۔ تو پھر انہیں انتظار و تردش کس بات کی ہے۔ یہ سیکولر ڈیماکریسی کی جگہ عیسائیت کا نظام کیوں نہیں رائج کر دیتے؟ اور اس کا جواب ایک فقرے میں یہ ہے کہ یہ عیسائیت کا نظام ہی تو تھا جس سے تنگ آکر انہوں نے سیکولر نظام رائج کیا تھا۔ عیسائیت (کلیسا) کی تھیاکریسی نے انسانیت پر جس قدر لرزہ انگیز اور دحشت ناک مظالم ڈھائے تھے، ان سے بچنے کے لئے انہوں نے سیکولرازم کی پناہ تراشی تھی۔ اس لئے وہ عیسائیت کی طرف تو قیامت تک رخ نہیں کر سکتے۔ ویسے بھی انہیں معلوم ہے کہ موجودہ عیسائیت (بائیبل، خواہ وہ عیسائیوں کی انجیل

ہو اور خواہ یہودیوں کی تورات) مبنی بر وحی نہیں۔ انسانوں کی خود ساختہ ہے۔ اس مقالہ میں میرا موضوع مذاہب کا تقابلی مطالعہ نہیں۔ لیکن عیسائیت کے متعلق ان مفکرین کی کیا رائے ہے، اس کی ایک جھلک دیکھ لینا غیر محل نہ ہوگا۔

عیسائیت کی ناکامی

پروفیسر جوڈ، لکھتا ہے:۔

عیسائیت کی رُو سے زندگی کا حقیقی مسکن یہ دنیا نہیں بلکہ آنے والی دنیا ہے۔ اُخروی دنیا خیر محض کی مظہر ہے۔ اس کے برعکس، یہ دنیا "شر و فساد" کی دنیا ہے۔ اُس دنیا کی حیات ابدی ہے، یہ دنیا محض عبوری حیثیت رکھتی ہے۔ اس دنیا میں کوئی شے خیر اور طیّب نہیں۔

(GUIDE TO THE PHILOSOPHY OF MORALS & POLITICS - P. 127)

ہسپانوی پروفیسر (DR. FALTA DE GRACIA) اس باب میں کہتا ہے:۔

عیسائیت میں عدل کا تصور بھی اسی طرح نامانوس ہے جس طرح ذہنی دیانت کا۔ یہ اس کے تصوّرِ اخلاق سے باہر کی چیز ہے ...... عدل و انصاف اور حق و باطل کی طرف سے عیسائیت کی روح یکسر بے حس ہے۔

(QUOTED BY BRIFAULT - IN - THE MAKING OF HUMANITY - P. 334)

پروفیسر وائٹ ہیڈ کی رائے ہے:۔

انجیل میں جس قسم کا اخلاقی ضابطہ دیا گیا ہے، اُسے اگر موجودہ معاشرہ میں نافذ کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ فوری موت کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

(ADVENTURE OF IDEAS - P. 18)

انہی حقائق کے پیشِ نظر، تہذیب کا مشہور امریکی مؤرخ، ڈورسی، اپنی کتاب (CIVILISATION) میں لکھتا ہے:۔

آج لاکھوں انسانوں کے نزدیک عیسائیت شکست خوردہ دل کا مذہب ہے، وہ اس مذہب کی قبولیت سے اعترافِ شکست کرتے ہیں۔ یہاں کوئی شے قابلِ اعتماد نہیں۔ "اطمینان کی آرزو باطل اور باطل آرزؤں کی تکمیل گناہ ہے۔" یہ اندازِ نگاہ صحیح اور تندرست زندگی کو ناممکن بنا دیتا ہے۔ اس سے انسانیت تباہ ہو جاتی ہے۔ (صفحہ ۴۲۶)

(۰)

اب سوال یہ ہے کہ کیا انسان اپنے مستقبل کی طرف سے مایوس ہو جائے، یا جس زندگی بخش نظام کی اسے تلاش ہے وہ کہیں سے مل سکتا ہے؛ وہ مل سکتا ہے اور ان پیمانوں پر پورا اترتا ہے (بلکہ ان سے بھی آگے جاتا ہے) جو ایسے نظام کے لئے ان مفکرین کے تصورات میں انگڑائیاں لے رہے ہیں۔ میں نے اس نظام کے سلسلہ میں ان

قرآنی نظام

مفکرین کی کتابوں کے اقتباسات پیش کئے ہیں۔ اب میں ان کے لئے ایک ایسی کتاب کے اقتباسات پیش کروں گا جس میں یہ نظام اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ جگمگا رہا ہے۔ اس کتاب کے متعلق خود مغرب کے اکثر محققین کا اعتراف ہے کہ وہ مبنی بر وحی ہے اور یکسر غیر محرف۔ اسے قرآن مجید کہا جاتا

ہے جو ہماری زندگی کے دائرے کا مرکز بھی ہے اور محیط بھی۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ان مفکرین کے نزدیک بنیادی طور پر صحیح نظام وہ ہے جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا (خواہ وہ ایک فرد ہو یا انسانوں کا گروہ) محکوم نہ ہو۔ قرآنِ مجید نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ کسی انسان کو حقِ حکومت حاصل ہی نہیں۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ۔ (آیت کا باقی حصہ بعد میں آئے گا۔ ۳/۷۸)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ——— خواہ اس کے پاس ضابطۂ قوانین ہو یا اقتدارِ حکمرانی حتیٰ کہ وہ نبی بھی کیوں نہ ہو ——— کہ وہ دوسرے لوگوں سے کہے کہ تم میرے محکوم بن جاؤ۔

آپ غور کیجئے کہ قرآنِ کریم نے کس طرح چند الفاظ میں اس بنیادی مسئلہ کو حل کر دیا جس میں نوعِ انسان موجِ مضطر کی طرح سرگرداں چلی آرہی تھی۔ اس آیت میں، مقننہ اور انتظامیہ کے علاوہ نبی تک کے متعلق کہہ دیا گیا ہے کہ اسے بھی حقِ حکومت حاصل نہیں!

قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ جب وہ کوئی اصول یا قانون دیتا ہے تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیتا ہے کہ ایسا حکم کیوں دیا گیا ہے۔ اس کی غرض و غایت اور حکمت کیا ہے۔ جب یہ کہا کہ کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر حقِ حکومت حاصل نہیں، تو اس کی وجہ یہ بتائی کہ

شرف و تکریمِ انسانیت

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰)۔ "ہم نے تمام انسانوں کو یکساں طور پر واجبُ التکریم پیدا کیا ہے"۔ اور تکریم و شرفِ انسانیت کا تقاضا ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم و محتاج نہ ہو۔ بالفاظِ دیگر قرآن کے نزدیک، انسانوں کی حکومت، شرف و تکریمِ انسانیت کے منافی ہے۔ ہمارے دور کا علم النفس کا ممتاز ماہر (ERICH FROMM) کہتا ہے کہ

> ایسی سیاسی آزادی جس میں انسان کو سطحِ انسانیت سے گرا دیا جائے۔ جس میں اسے (DEHUMANISE) کر دیا جائے، آزادی نہیں رہتی۔ غلامی بن جاتی ہے۔
>
> (THE REVOLUTION OF HOPE - P. 91.)

شرف و تکریمِ انسانیت یا احترامِ آدمیت تو خدا کا عطا کردہ ہے۔ قرآن کی رُو سے مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ، نہ صرف اس شرف و تکریم کی حفاظت کرے، بلکہ ایسے حالات پیدا کرے جن میں شرف و تکریم کی صلاحیتیں نشوونما پاتی اور بڑھتی، پھولتی، پھلتی چلی جائیں۔ یہی وجہ ہے جو قرآنِ کریم نے اللہ تعالیٰ کی بنیادی صفت جس سے اس کتابِ عظیم کا آغاز ہوتا ہے، ربوبیّتِ عالمینی قرار دی ہے۔ (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۱/۱) ظاہر ہے کہ وہی نظام منشائے خداوندی کو پورا کرنے والا ہو گا جو خدا کی اس صفت کا مظہر ہو۔ ایرک فرام دوسرے مقام پر لکھتا ہے:-

زندگی کا تقاضا زندہ رہنا اور بڑھنا پھلنا پھولنا ہے۔ اگر اس کے اس تقاضے کے راستے میں

رکاوٹ پیدا ہو جائے تو اس مسدود توانائی میں ایک تبدیلی واقع ہو جاتی ہے اور وہ زندگی کو نشوونما دینے کے بجائے اسے تباہ کر دینے کا موجب بن جاتی ہے۔ یاد رکھئے تخریب یا تباہی (UNLIVED LIFE) ؎۱ کا فطری نتیجہ ہے۔ وہ افراد یا معاشرتی حالات جو زندگی کا راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں تخریب پیدا کرتے ہیں۔ اور تخریب وہ سرچشمہ ہے جس سے شر کے مختلف مظاہر پھوٹتے ہیں۔ (MAN FOR HIMSELF - P. 218)

(BARKER) جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، کہتا ہے:۔

وہی معاشرہ عدل کا علمبردار کہلا سکتا ہے جس کا مقصود یہ ہو کہ تمام افرادِ معاشرہ کی ذات کی صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما ہو جائے۔ (P. 123)

انسانوں کی حکمرانی میں، محکوموں کے دل میں خوف پیدا ہو جاتا ہے (انسانی حکومت قائم ہی خوف کے زور پر رہتی ہے) اور خوف، انسانی ذات کے تباہ اور اسے شرف و تکریم سے محروم کر دینے کا بنیادی سبب ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں:۔

خوف و حزن

اسلام، نظامِ فطرت میں کرب و اذیت، گناہ اور کش مکش کے وجود کو تسلیم کرتا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ انسان کے اخلاقی ارتقاء کے راستے میں یہ موانعات حائل نہیں۔ یہ درحقیقت خوف ہے جس کا یہ شکار ہوتا ہے۔ انسان اپنے سلسلۂ ارتقاء کی بلند ترین سطح پر اس وقت پہنچتا ہے جب وہ خوف و حزن سے آزاد ہو جائے ...... اسلام کا اخلاقی نصب العین یہ ہے کہ وہ انسان کو خوف و حزن سے آزاد کر کے اسے اس کی ذات کی ممکنات اور مضمر قوتوں کا احساس دلا دے اور اس کے شعور میں اس حقیقت کو بیدار کر دے کہ اس کی ذات، لامتناہی قوتوں کا سرچشمہ ہے ...... پھر سمجھ لیجئے کہ دنیا میں ہر برائی (VICE) کی جڑ خوف ہے۔

(THOUGHTS & REFLECTIONS - P.P. 34-37)

؎۱ ان الفاظ کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا۔ کسی کی غزل کا ایک شعر ہے جس کا تعلق تو رومانی جذبات سے ہے لیکن اس میں، عمر اور زندگی میں جو فرق کیا گیا ہے اس سے (UNLIVED LIFE) کے مفہوم کی خفیف سی جھلک سامنے آجاتی ہے، اگرچہ ابرکٹ فرام نے یہ الفاظ جس مفہوم کے لئے استعمال کئے ہیں وہ بہت بلند ہے۔ وہ شعر ہے ؎

جی لیا چار دن جوانی میں! زندگی عمر بھر نہیں ہوتی

یعنی جس "عمر" میں "زندگی" نہیں ہوگی وہ (UNLIVED LIFE) ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم نے جہنم کی زندگی کے متعلق کہا ہے کہ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى (۲/۸۷) اس میں نہ زندگی ہوگی نہ موت۔ یہ وہ اندازِ زیست ہے جسے (UNLIVED LIFE) کہا جائے گا۔

اسی حقیقت کو وہ "مثنوی رموزِ بے خودی" میں ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:۔

ہر شرِ پنہاں کہ اندر قلبِ تست | اصلِ او بیم است، اگر بینی درست
لابہ و مکاری و کین و دروغ | ایں ہمہ از خوف می گیرد فروغ
پردۂ زور و ریا، پیراہنش | فتنہ را آغوشِ مادر دامنش
ہر کہ رمزِ مصطفیٰ فہمیدہ است!
شرک را در خوف مضمر دیدہ است (صفحہ ۱۱۰)

"شرک" انسانوں کی حکمرانی کا نام ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے، خدا کی متعین کردہ حدود پر قائم شدہ نظامِ حکومت کی بنیادی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲/۳۸) اس میں کسی کو کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوگا۔

سوال یہ ہے کہ جب قرآن نے انسانوں کی حکومت کو مردود قرار دے دیا، تو اس سے کیا یہ مراد ہے کہ وہ انسانی دنیا کے لئے حکومت کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ بات یہ نہیں۔ وہ حکومت کو ضروری قرار دیتا

خدا کی حکومت

ہے لیکن "خدا کی حکومت" کو۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰) "یاد رکھو! حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔" وہ اپنے اس حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ لَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهٖٓ اَحَدًا۔ (۱۸/۲۶)۔

لیکن خدا تو غیر مرئی اور غیر محسوس ہستی ہے ——— غیر مرئی اور غیر محسوس تو ایک طرف، اس کی ذات تو کسی کے تصور تک میں نہیں آسکتی۔ تو پھر اس کی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟ اس نے کہا کہ ہماری حکومت سے مراد، اس کتاب کی حکمرانی ہے جسے ہم نے وحی کے ذریعہ نازل کیا ہے۔ اس نے جملہ انبیاء کرام کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ:۔

> وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (۲/۲۱۳)
> خدا نے ان انبیاء کے ساتھ الکتاب (ضابطۂ قوانین) نازل کیا تاکہ وہ اس کے مطابق لوگوں کے اختلافی امور کے فیصلے کیا کریں۔

قانونِ خداوندی کی حکمرانی

شخصیت کے بجائے، قانون کی حکمرانی کا تصور، انسان کو کن بلندیوں پر لے جاتا ہے، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے! اور پھر قانون بھی وہ جو کسی انسان کا وضع کردہ نہ ہو۔ اسلام میں بلند ترین اور عظیم ترین شخصیت، حضور نبی اکرمؐ کی ہے۔ خدا نے حضورؐ کو بھی یہ حکم دیا کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ۔ (۵/۴۸) "اے رسول! تم لوگوں کے اختلافی امور کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کیا کرو۔" سربراہِ مملکت، بلکہ یوں کہیئے کہ خود رسول اللہؐ بھی اسی کتاب کا اتباع کرتے تھے۔ (۶/۵۰؛ ۷/۲۰۳) اور اس کی خلاف ورزی کو خود اپنے لئے بھی مستوجبِ سزا قرار دیتے تھے (۶/۱۵)۔ حقِ مطلق۔ اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNTY) بھی اسی کتاب کو حاصل تھا، مملکت یا سربراہِ مملکت کو نہیں۔ (SOVEREIGN) کی تعریف یہ

کی جاتی ہے۔

(ACCOUNTABILITY TO NONE.)

جو کسی کے سامنے جواب دِہ نہ ہو، کوئی اس سے باز پرس نہ کر سکے۔ قرآن مجید نے دوٹوک فیصلہ کر دیا کہ

لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُونَ (۲۱/۲۳)

صرف خدا کی ذات ایسی ہے جو کسی کے سامنے جواب دِہ نہیں۔ باقی سب جواب دِہ ہیں۔ اس سے کتاب اللہ کی حکمرانی کا صحیح مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے۔

اس کتاب میں دیئے گئے احکام و اصول و اقدار کے متعلق کہا کہ

تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۶)

تیرے رب کے کلمات (احکام و قوانین) صدق اور عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔

حتیٰ کہ رسول اللہؐ بھی نہیں۔ فرمایا:۔

قُلْ مَا يَكُوْنُ لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ ....(۱۰/۱۵)

اے رسول: ان سے کہہ دو کہ مجھے بھی اس کا کوئی اختیار نہیں کہ میں اپنی طرف سے اس کتاب میں کسی قسم کا ردّ و بدل کر سکوں۔

اس کتاب کا اطلاق تمام قوموں پر، اور تمام زمانوں میں ہوگا۔ اس لئے اسے ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (۳۸/۸۷) کہا گیا ہے۔ یعنی تمام اقوام عالم کے لئے ضابطہ ہدایت۔

ان تصریحات کے بعد آیئے اس آیۂ جلیلہ کی طرف جو اس نظام خداوندی کی عروۃ الوثقیٰ ہے اور جس کا تھوڑا سا حصہ پہلے پیش کیا گیا ہے۔ پوری آیت یوں ہے:۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (۳/۷۹)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں —— خواہ اسے ضابطہ قوانین، یا اقتدار حکومت، اور نبوّت تک بھی کیوں نہ حاصل ہو۔ کہ وہ لوگوں سے کہنا شروع کر دے کہ تم خدا کی نہیں، میری محکومی اختیار کرو۔ اسے یہی کہنا چاہیئے کہ تم سب، اس کتاب کی اطاعت سے جس کی تم دوسروں کو تعلیم دیتے ہو، اور جس پر غور و فکر سے تم اس کے معانی کی تہ تک پہنچتے ہو، ربّانی بن جاؤ، یعنی خدا کے محکوم۔

اس آیت نے انسانوں کے حقِ حکومت پر یک قلم خطِ تنسیخ کھینچ دیا اور مذہبی پیشوائیت کا بھی خاتمہ کر دیا۔ جب اس نظام میں نبی کو بھی اس کا حق حاصل نہیں کہ لوگوں سے اپنے احکام کی اطاعت کرائے، تو مذہبی پیشواؤں کو اس کا حق کیسے حاصل ہو جائے گا۔ ان کا تو اس نظام میں وجود تک نہیں ہوگا۔ ان کے متعلق

تھیا کریسی کا خاتمہ

قرآن کہتا ہے کہ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ (۹/۳۴) "وہ لوگوں کی محنت کی کمائی ناجائز طور پر کھا جاتے ہیں اور خدا کی طرف جانے والے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں"۔ اس طرح قرآن نے تھیا کریسی کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔

اور یہی ہے وہ کتاب جس نے اس نے غلط اور صحیح نظام میں حدِ امتیاز قرار دیا ہے۔ فرمایا کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (۵/۴۴)

جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہی کافر ہیں۔

اسلام، قرآنِ مجید کے مطابق نظامِ حکومت قائم کرنے کا نام ہے۔ جو نظامِ حکومت اس کے مطابق نہیں، وہ کافرانہ نظام ہے۔

ہم پوچھتے ہیں مغربی مفکرین اور مدبرین سے کہ جس قسم کے نظام کی آپ کو تلاش ہے، کیا وہ اس کتابِ عظیم کے اندر نہیں ملتا؟ صحیح نظامِ انسانیت کے لئے جو پیمانے آپ نے مقرر کئے ہیں، کیا یہ ان پیمانوں پر پورا نہیں اترتا؟ اس نظام کو (کسی پر زبردستی ٹھونسنا تو ایک طرف کیونکہ قرآن اس کی اجازت نہیں دیتا) ہم از خود آپ کے سامنے پیش بھی نہیں کر رہے۔ آپ اس کے متلاشی تھے۔ ہم نے صرف اس کا پتہ نشان بتا دیا ہے۔ آپ اس پر خود غور کر لیں۔ اگر یہ فی الواقعہ آپ کے ...... پیش کردہ پیمانوں پر پورا اترے تو پھر اس کے اختیار کرنے میں، تو آپ کو کسی قسم کا تامل نہیں ہونا چاہیئے۔ اس سے اقوامِ عالم اس جہنم سے نجات حاصل کر لے گی جس میں وہ اس وقت مبتلا ہے۔ لیکن اگر انہوں نے اسے اس وقت قبول اور اختیار نہ بھی کیا تو اس سے اس کی ناکامی لازم نہیں آئے گی۔ نوعِ انسان نے بالآخر اس کی طرف آنا ہے کہ اس کا دعویٰ ہے کہ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ (۹/۳۳) اس نے آخر الامر ہر نظام پر غالب آ کر رہنا ہے۔ نوعِ انسان اسے جتنی جلدی اختیار کر لے گی، مزید تباہیوں سے بچ جائے گی۔

اب آئیے اس نظام کے اس گوشے کی طرف جس کے متعلق وہائٹ ہیڈ نے کہا ہے کہ اسے ثبات اور تغیر کا امتزاج ہونا چاہیئے۔ یعنی اپنی جگہ غیر متبدل بھی اور زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دینے والا بھی۔

ثبات و تغیر کا امتزاج

قرآنِ مجید کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں تھوڑے سے متعین احکام ہیں اور زندگی کے دیگر امور کے متعلق اصول اور اقدار دیئے گئے ہیں اور اسے قرآنی مملکت پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ ان اصول و اقدار کو نافذ کرنے کے طور طریقے، اپنے زمانے کے حالات اور تقاضوں کے مطابق خود وضع کرے۔ اس کے اصول اور اقدار تو ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے لیکن ان کی تعمیل کیلئے طور طریقے (جنہیں آپ جزئی قوانین' یا "بائی لاز" کہ لیجئے) حالات کے مطابق بدلتے رہیں گے۔ ثبات (غیر متبدل) اور تغیر (بدلنے والی جزئیات) کے

امتزاج سے یہ نظام رواں دواں آگے بڑھتا جائے گا۔ جس نظام کو تمام اقوامِ عالم کے لئے ہمیشہ تک نافذ العمل رہنا ہو اُسے ایسا ہی ہونا چاہیئے۔

مشاورت

یہ جزئی قوانین باہمی مشاورت سے وضع کئے جائیں گے۔ خود حضور نبی اکرمؐ سے ارشادِ خداوندی ہے وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳/۱۵۸) امورِ مملکت میں ان (اپنے رفقاء) سے مشورہ کیا کرو۔ اور اس طرح حضورؐ کے بعد، ملّتِ اسلامیہ سے متعلق کہا کہ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) "ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے"۔

ایک بات بالکل واضح ہے۔ اور وہ یہ کہ قرآن کریم کے احکام، اصول و اقدار (کلمات اللہ) غیر متبدّل ہیں۔ لہٰذا ان میں، اُمّت تو ایک طرف، خود نبی اکرمؐ بھی کسی قسم کی تبدیلی نہیں کر سکتے تھے۔ جن کلمات اللہ میں، کسی تبدیلی کی گنجائش یا امکان نہ ہو، ان میں کسی قسم کے مشورہ کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ یہ مشاورت، ان اصولوں کی حدود کے اندر رہتے ہوئے مملکت کے نظم و نسق کے بارے میں ہوگی۔ اس لئے اس کے لئے : اَمر کا لفظ آیا ہے۔ یعنی یہ مشاورت امورِ مملکت میں ہوگی۔ پھر اس مشاورت کا حکم بھی اصولی طور پر دیا گیا ہے۔ مشاورت کی مشینری اللہ تعالیٰ نے خود وضع اور متعیّن نہیں کی۔ ہر زمانے کی قرآنی مملکت جس قسم کی مشینری مناسب سمجھے، اختیار کر سکے گی۔ تجربہ کے بعد، یا مرورِ زمانہ سے اس مشینری میں ردّ و بدل ہو سکے گا لیکن وہ حدود اپنی جگہ غیر متبدّل رہیں گے جن کے اندر رہتے ہوئے یہ مشاورت عمل میں آئے گی۔ یعنی اس مشاورت سے بھی کوئی ایسا فیصلہ نہیں کیا جا سکے گا جو کسی طرح بھی قرآن مجید کے احکام و اصول سے ٹکرائے۔ قرآنی مملکت کا اتنا ہی اختیار ہوگا۔ یعنی اس کا فریضہ قرآنی احکام و اصول کا نفاذ ہوگا اور اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے طور طریق وضع کرنا، اس کے اختیارات کی حد۔ آپ اس کا مقابلہ مغربی جمہوریت سے کیجئے۔ اسلامی اور کا فرانہ نظام نکھر کر

جمہوریت اور مشاورت

سامنے آجائے گا۔ مغربی نظام جمہوریت ان بنیادوں پر قائم ہے کہ

(۱) اقتدارِ اعلیٰ یا اختیارِ مطلق، قوم یا عوام کو حاصل ہے۔

(۲) قوم اس اختیار کو اپنے منتخب نمائندگان کو تفویض کر دیتی ہے۔

(۳) یہ نمائندگان یا ان کی اکثریت جس قسم کے قوانین چاہیں وضع کر سکتے ہیں۔ ان کے قانون سازی کے اختیارات پر کسی قسم کا کنٹرول نہیں۔ کوئی حدود و قیود نہیں۔ انہیں اس کا حقِ مطلق حاصل ہے —— قانون سازی کا یہی وہ حقِ مطلق ہے جس کے خلاف مغربی مفکّرین صدائے احتجاج بلند کر رہے ہیں۔

اس کے برعکس، قرآنی مشاورت میں قانون سازی کا حقِ مطلق کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔ یہ مشاورت یا جزئی قانون سازی، قرآن کی غیر متبدّل حدود کے اندر رہتے ہوئے کی جا سکتی ہے۔ اس مملکت کی دستور اور قوانین ساز "اسمبلی" کوئی ایسا قانون نہیں مرتب کر سکتی جو قرآنی حدود سے ٹکرائے۔ مغربی مفکّرین اسی قسم کے نظام کی تلاش میں ہیں۔

—— (٥) ——

اسلام کے صدرِ اوّل میں اسلامی نظام کا نقشہ یہی تھا۔ اس میں مشاورت کی مشینری کس قسم کی تھی؟ اس کے متعلق حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس لئے کہ ہماری تاریخ بالکلیہ قابلِ اعتماد نہیں۔ اس میں ہر قسم کے متضاد واقعات اور کوائف مل جاتے ہیں۔ اس میں ویٹو کی رُو سے فیصلوں کی مثالیں بھی مل جائیں گی اور کثرتِ رائے کی رو سے فیصلوں کی مثالیں بھی۔ اس باب میں میرا مسلک یہ ہے کہ اس میں جو واقعات ایسے ہوں جو قرآنِ کریم کی تعلیم اور پیغام کے مطابق ہوں، یا کم از کم اس کے خلاف نہ ہوں، انہیں صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اس مسلک کے مطابق، اس دور کے اندازِ مشاورت کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ جو ہمارے نزدیک منشائے قرآنی کے مطابق ہے۔ حجاز میں رقباتِ اراضی چنداں بڑے نہیں تھے اس لئے ان کے نظم و نسق کے لئے زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں عراق فتح ہوا تو وہاں بڑی وسیع و عریض اور نہایت زرخیز و شاداب اراضیات مملکت کی تحویل میں آئیں۔ اس وقت اس سوال نے پہلی مرتبہ ایسی اہمیت حاصل کی کہ یہ معاملہ مجلسِ مشاورت میں بحث کا موضوع بن گیا۔

صدرِ اوّل میں مشاورت

حضرت عمرؓ نے معاملہ زیرِ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ان کی رائے میں ان اراضیات کو افراد میں تقسیم نہیں کرنا چاہیئے۔ اسے مملکت کی تحویل میں رہنا چاہیئے اور اس کا نظم و نسق علیٰ حالہٖ قائم رہنے دینا چاہیئے۔ بعض صحابہؓ نے اس تجویز کی مخالفت میں تقاریر کیں۔ معاملہ کی اہمیت کے پیشِ نظر، اس بحث کو دوسری نشست پر اٹھا رکھا جس میں انصار کے قبیلہ، اوس و خزرج کے عمائد کو بھی دعوت دی کیونکہ وہ اراضیات کے معاملہ میں بہتر تجربہ رکھتے تھے۔ اس مجلس کا افتتاح کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے جو تقریر فرمائی وہ بڑی غور طلب ہے۔ آپؓ نے کہا:-

> میں نے آپ حضرات کو اس لئے دعوت دی ہے کہ جس بارِ امانت کو آپ نے میرے سر پر رکھا ہے اس کی ادائیگی میں آپ میری اعانت فرمائیں۔ اس وقت مجلس میں میری حیثیت خلیفہ کی نہیں بلکہ آپ میں سے ایک فرد کی سی ہے۔ اس لئے آپ میں سے ہر شخص کو اپنی رائے آزادی سے پیش کرنے کا حق حاصل ہے۔ میں نے جو تجویز پیش کی تھی اس میں بعض حضرات نے میری مدافعت کی تھی اور بعض نے مخالفت۔ مجھے نہ اس پر ملال ہے کہ اس باب میں کس نے میری مخالفت کی ہے۔ نہ اس پر فخر کہ کس نے میری موافقت کی ہے۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ آپ حضرات میری مرضی کا اتباع کریں۔ اور جسے آپ حق سمجھتے ہیں اسے میری خاطر چھوڑ دیں۔ میں آپ کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ جسے میں حق سمجھتا ہوں۔ (اور حق کا معیار اللہ کی کتاب ہے)۔ یہ کتاب جس طرح میرے پاس موجود ہے اسی طرح آپ کے پاس بھی ہے۔ یہی ناطق بالحق ہے۔ آپ اسے اپنے سامنے رکھ کر جواب دیں کہ اس باب میں اس کا فیصلہ کیا ہے۔ اس پر عمل کرنا ہم سب کا فرض ہوگا۔ (شاہکارِ رسالت۔ صفحہ ۳۸۵)

آپ نے غور فرمایا کہ باہمی مشاورت کا مقصد کیا تھا؟ یہ مقصد کہ خدا کی کتاب پر غور و خوض کے بعد یہ طے کیا

جائے کہ اس باب میں اس کا منشا کیا ہے۔ اس نشست میں بھی معاملہ طے نہ ہوا تو آپ نے تین دن کی مزید مہلت چاہی تاکہ قرآن مجید پر زیادہ تعمق سے غور کر لیا جائے۔ تین دن کے بعد آپ نے مجلس سے کہا کہ میں نے قرآن مجید پر مزید غور و فکر کیا تو للہ الحمد کہ مجھے اس میں سے راہ نمائی مل گئی۔ اس کے بعد آپ نے سورۂ حشر کی آیات تلاوت فرمائیں اور کہا کہ ان میں کہا گیا ہے کہ

وَالَّذِينَ جَاءُو مِنۢ بَعْدِهِمْ۔ (۵۹/۱۰)

ان میں ان لوگوں کا بھی حق ہے جو ان کے بعد آئیں گے۔

روایات میں ہے کہ حضرت عمرؓ کے اس قرآنی استدلال کو سن کر صحابہؓ کے چہرے خوشی سے تمتما اٹھے اور مخالفین اور موافقین سب جوشِ مسرت سے پکار اٹھے کہ "آپ کی تجویز بالکل درست ہے۔ ہم سب آپ سے متفق ہیں"۔

یہ تھا اندازِ مشاورت اسلام کے صدرِ اوّل میں۔ یعنی اس میں تحقیق یہ کیا جانا مقصود ہوتا تھا کہ معاملہ زیرِ نظر کے متعلق قرآن مجید کا ارشاد یا منشا کیا ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس مشاورت اور مغربی جمہوریت میں کس طرح بعد المشرقین ہے! وہ حضرات اپنی رائے اور وحی میں کس قدر فرق ملحوظ رکھتے تھے؟ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے کسی معاملہ میں رائے دی تو کسی نے کہا کہ "یہ اللہ اور عمرؓ کی رائے ہے"۔ آپؓ نے اسے فوراً ٹوکا اور فرمایا کہ "تو نے بہت بری بات کی ہے۔ یہ صرف عمرؓ کی رائے ہے۔ اگر درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے۔ اور غلط ہے تو عمرؓ کی طرف سے"۔ اس کے بعد تھوڑی دیر خاموش رہے اور پھر فرمایا کہ "یاد رکھو! رائے غلط بھی ہو سکتی ہے۔ اسے اُمت کے لئے سنت نہ بنانا"۔ ان آخری الفاظ میں اسلام میں قانون سازی کے اصول پر بڑی نمایاں روشنی پڑتی ہے۔ وہ اصول یہ ہے کہ اگر (بفرضِ محال) ہمیں حتمی طور پر معلوم بھی ہو جائے کہ اُس زمانے میں کسی معاملہ کو کس طریق سے طے کیا گیا تھا، تو وہ طریقہ ابدی طور پر غیر متبدل دین نہیں قرار پا سکتا۔ وہ طریق اُس زمانے کے حالات کے مطابق انہی کے لئے تھا۔ بعد کی اسلامی مملکت اپنے حالات کے مطابق اپنے لئے خود طریق وضع کر سکتی ہے۔ جو بات اس زمانے میں (یا کسی بعد کے زمانے میں) باہمی مشاورت سے طے پائی تھی وہ بہر حال انسانوں کی رائے تھی۔ اور (جیسا کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا) انسانی رائے ابدی طور پر دین نہیں بن سکتی۔

—(۰)—

یہ تھا قرآن کریم کی رو سے، اسلامی مملکت کا نظامِ حکومت۔ اس سے ظاہر ہے کہ مغرب کا نظامِ جمہوریت اور اسلامی نظام ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ لیکن غلامانہ ذہنیت بڑی پختہ اور غیر شعوری طور پر دل کی گہرائیوں میں پیوست ہوتی ہے۔ غلام قوم طبیعی آزادی حاصل ہو جانے کے بعد بھی ان کی ذہنیت غلامانہ ہی رہتی ہے اور اسے بدلنے میں بڑا وقت بھی لگتا ہے اور

ہم اور جمہوریت

سخت محنت بھی درکار ہوتی ہے۔ مغربی جمہوریت کی حمد و ستائش کے قصیدے ہمارے دورِ غلامی میں ہمارے کانوں میں پڑے۔ انگریز یہاں سے چلا بھی گیا لیکن یہ قصائد ابھی تک ہمارے دل کی گہرائیوں میں تہ نشین ہیں۔ چنانچہ ہمارے ہاں جمہوریت کو عین مطابقِ اسلام قرار دیا جاتا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ۱۹۷۷ء میں تبدیلیٔ حکومت کے لئے جو تحریک اٹھی تھی اسے "بحالیٔ جمہوریت" کی اسلامی تحریک کہا جاتا تھا۔ اس تحریک کا مقصد شخصی حکومت کی جگہ قومی حکومت قائم کرنا تھا اور چونکہ قومی حکومت کے لئے مغرب میں جمہوریت کی اصطلاح رائج ہے اس لئے انہوں نے بھی یہی کہنا شروع کر دیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ شخصی حکومت کے مقابلہ میں قومی حکومت قابلِ ترجیح ہوتی ہے لیکن ان میں سے ایک کو غیر اسلامی اور دوسری کو اسلامی کہنا بنیادی طور پر غلط ہے۔ شخصی حکومت اور مغربی انداز

کی جمہوری حکومت دونوں خلافِ اسلام ہیں۔ اسلامی حکومت وہ ہے جس میں حکمرانی کتاب اللہ کی ہو۔ اور کتاب اللہ کی حکمرانی اس وقت مسلمانوں کی کسی مملکت میں بھی نہیں۔ لہٰذا، ان ممالک میں جہاں جمہوریت کا ذکر کیا جائے گا اس سے مراد شخصی حکومت کے برعکس، مغربی جمہوریت کے انداز کی حکومت ہوگی۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، سیکولرازم (خلافِ اسلام نظام) کے نقطۂ نگاہ سے تو اس بحث کی گنجائش ہے کہ شخصی نظامِ حکومت اچھا ہے یا جمہوری انداز، لیکن قرآنی زاویۂ نگاہ سے اس بحث کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اقبالؒ نے اس بحث کو بڑی عمدگی سے یہ کہہ کر نمٹا دیا کہ

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اور دین سے ان کی مراد قرآن ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ

گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بقرآں زیستن

(۰)

چونکہ پاکستان اسلام کے نام سے حاصل کیا گیا تھا اس لئے ہمارے ہاں یہ فیشن سا ہوگیا ہے کہ کوئی بات کی جائے اس کے ساتھ لفظ اسلام کا تکمہ ضرور لگا لیا جائے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ کچھ عرصہ پہلے جب یہاں معاشی نظام کی بات چلی تھی تو سوشلزم کے حامیوں کے خلاف یہ اعتراض کیا گیا تھا کہ یہ نظام اسلام کے خلاف ہے۔ انہوں نے جھٹ سے کہہ دیا کہ ہم یہاں سوشلزم نہیں بلکہ اسلامی سوشلزم نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک سوشلزم کے ساتھ لفظ اسلامی کے لاحقہ سے لادینی سوشلزم عین اسلامی ہوگئی۔ مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا۔ تقسیمِ ہند کے بعد کراچی میں کچھ ہنگامے ہوئے جن میں تخریب پسندوں نے لوٹ مچائی۔ عمارات پر پتھراؤ کیا۔ دکانوں کو جلایا۔ اس خطرہ کے پیشِ نظر دکانداروں نے اپنی دکانیں بند کر دیں۔ وہاں ایک بند دکان کے کواڑ کے باہر جلی حروف میں لکھا تھا "یہ شراب کی اسلامی دکان ہے۔ اسے کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے"۔ ہمارے ہاں اس طرح ہر غیر اسلامی بات 'اسلامی' ہوجاتی ہے۔ یہی صورت اسلامی جمہوریت کی ہے۔ واضح رہے کہ جب کوئی لفظ بطورِ اصطلاح کے رائج ہوجائے تو اس کے لغوی معانی نہیں بلکہ اصطلاحی معانی لئے جاتے ہیں۔ سوشلزم کی طرح جمہوریت بھی ایک اصطلاح ہے جس سے مراد مغرب کا سیکولر جمہوری نظام ہے۔ اس اعتبار سے "جمہوریت" اور "اسلامی" دو متضاد عناصر ہیں جو آپس میں مل نہیں سکتے۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ اس اصطلاح کو ہمارے ہاں شخصی نظامِ حکومت سے تمیز کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے اسے خالی "جمہوریت" یا "جمہوری نظام" کہیئے۔ "اسلامی" کا لاحقہ تو اس کے ساتھ نہ لگائیے۔ اس (پاکستانی) نظام کے اسلامی ہونے کی شرط پہلے بیان ہوچکی ہے۔ یعنی اگر اس نظام میں کتاب اللہ کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہے، حکمرانی اس کی ہے۔ تو وہ اسلامی ہے۔ اگر ایسا نہیں تو وہ اسلامی نہیں (خواہ وہ شخصی ہو اور خواہ جمہوری۔ ترکی اور ملکوں کی طرح) ہمارے آئین میں بھی پاکستان کو "اسلامی جمہوریہ" کہا گیا ہے۔ نہ صرف یہ کہ قرآنی اصول کے مطابق یہ مملکت ابھی تک اسلامی نہیں بنی، اس میں جب کبھی "جمہوری" نظام رائج ہوا ہے اس کی جزئیات تک بھی مغربی جمہوریت سے مستعار لی گئی ہیں۔ اس میں اس پر تو بحث ہوتی ہے کہ سسٹم پارلیمانی ہونا چاہیئے یا صدارتی۔ یہ سوال کبھی زیرِ بحث نہیں آتا کہ اسے "اسلامی" کس طرح بنایا جائے۔ گویا اس طرف سے قوم بالکل مطمئن ہے کہ چونکہ اس کا نام اسلامی جمہوریہ ہے اس لئے یہ مملکت اسلامی ہے۔

الفاظ کے لغوی اور اصطلاحی معنوں میں کس قدر بنیادی فرق ہوتا ہے اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ تھیاکریسی [Theocracy] کے لغوی معنی ہیں "خدا کی حکومت" لیکن اصطلاح میں یہ مذہبی پیشواؤں کی حکومت کو کہا جاتا ہے جس میں ہر غیر خدائی حربہ خدا

کے نام پر استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ڈیماکریسی (DEMOCRACY) کے لغوی اور اصطلاحی دونوں معانی یکساں ہیں۔ یعنی عوام کی حکومت۔ یہ، لغوی اور اصطلاحی ہر دو لحاظ سے اسلام کے خلاف ہے۔ ہمارے ہاں ایک آواز اٹھی تھی کہ "اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں"۔ تو مذہبی حلقوں کی طرف سے اس کے خلاف سخت احتجاج ہوا تھا۔ ان کے نزدیک یہ آواز تو خلافِ اسلام تھی لیکن جمہوریت عین مطابقِ اسلام تھی۔ یعنی انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ خود جمہوریت کے معنی یہ ہیں کہ اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں یا حقِ حکومت عوام کو حاصل ہے۔

بعض مذہبی حلقوں کی طرف سے جمہوریت کی مخالفت ہوتی ہے۔ یہ اس لئے نہیں کہ ان کے نزدیک یہ نظام قرآن کے خلاف ہے۔ اس کی وجہ کچھ اور ہے۔ صدرِ اوّل کے بعد ہمارے ہاں ملوکیت مسلط ہو گئی جو آج تک چلی آرہی ہے۔ ملوکیت کے خلافِ قرآن ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں۔ قرآن تو اس کی جڑ کاٹنے کے لئے آیا تھا۔ بقول اقبالؒ ؂

هنوز اندر جہاں آدم غلام است　　　نظامش خام و کارش ناتمام است

غلامِ فقرِ آں گیتی پناہم!　　　کہ در دینش ملوکیت حرام است　　　(ارمغانِ حجاز ص۱۴)

ہمارے ہاں کی تاریخ۔ روایات۔ فقہ، سب دورِ ملوکیت میں مرتب ہوئے۔ انہی کے مجموعے کا نام (مروجہ) اسلام ہے۔ ان کے مرتب کرنے والے ہمارے واجب الاحترام مقتدا ہیں۔ لیکن (جہاں تک میری نگاہ کام کرتی ہے) ہمیں کہیں یہ دکھائی نہیں دیتا کہ ان میں سے کسی نے ان بادشاہوں سے کہا ہو کہ تمہاری حکومت اصلاً خلافِ اسلام ہے۔ عقائد اور مسالک کے اختلاف کی بنا پر ان بزرگوں میں سے بعض نے ان سلاطین کے ہاتھوں صعوبات بھی برداشت کیں، لیکن اصل و بنیاد (ملوکیت) کو خلافِ اسلام قرار دینے کی آواز کہیں سے سنائی نہ دی۔

اس کے برعکس محراب و منبر سے ان کے حق میں تعریف و تحسین کے کلمات اور خطبوں میں ان کی مملکت کے استحکام و فروغ کی دعاؤں کی صدائے بازگشت آج تک سنائی دیتی ہے۔ اب اگر ہمارے مذہبی پیشوا شخصی حکومت، کی مخالفت کریں تو ان سے پہلا سوال یہ پوچھا جائے گا کہ پھر آپ ان اسلاف کے متعلق کیا کہیں گے جنہوں نے ملوکیت کے خلافِ اسلام ہونے کے متعلق ایک لفظ تک نہ کہا۔ اس کے برعکس الیافعی نے اپنی تاریخ میں یزید بن عبدالملک کے زمانے کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ اتوہ اربعین شیخاً وشھدوا لہ ان الخلفاء لاحساب علیھم ولا عذاب۔ "چالیس شیوخ نے آکر اس امر کی گواہی دی کہ خلفاء قیامت کے دن بلا حساب بخشے جائیں گے۔ ان پر کوئی عذاب نہیں ہوگا۔ (تاریخ الیافعی ص۲۲۲۔ بحوالہ طلوعِ اسلام۔ جولائی ۱۹۶۸ء ص۳۲)۔ فقہ حنفی کے مشہور امام جصاص نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ "مدعین کا ایک گروہ پیدا ہو گیا تھا جن کا خیال تھا کہ ظلم و جور اور بیگناہوں کے قتل وغیرہ افعال کا صدور بادشاہِ وقت سے اگر ہو تو اس کے خلاف آواز بلند کرنا شرعاً صحیح نہیں۔ ان بادشاہوں کے سوا عوام کو ٹوکنا درست ہے۔ اور وہ بھی صرف زبان کی حد تک۔ ہتھیار تو بہرحال کسی کے خلاف اٹھانا شرعاً جائز نہیں۔ (احکام القرآن جلد دوم ص۳۲۔ بحوالہ ایضاً)۔ فقہ حنفی البتہ اس باب میں اتنی سی رعایت برتتی ہے کہ

كل شيء صنعه الامام الذي ليس فوقه امام فلاحد عليه الا القصاص (ہدایہ اولین۔ مجیدی ص۴۹۳)

ایسا امیر جس کے اوپر کوئی دوسرا امیر نہ ہو، قتل کے سوا کوئی جرم بھی کرے، تو اس پر حد نہیں۔

جن حضرات کے عقائد اس قسم کے ہوں وہ شخصی حکومت کو کس طرح خلافِ اسلام قرار دے دیں گے؟ ویسے بھی مذہبی پیشوائیت بنیادی طور پر شخصی حکومت ہی ہوتی ہے۔ وہ انہیں فقہی قوانین کی ترویج کی اجازت دے دیتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ اسلام کا منشا پورا ہو گیا خواہ اسلوبِ حکومت کسی قسم کا ہو۔

۱؎ ان حقائق کو مولانا مناظر احسن گیلانی (مرحوم) نے اپنی کتاب "حضرت امام ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی" ص۲۵۔ شائع کردہ نفیس اکاڈمی کراچی

[redacted]

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے ہاں جو لوگ جمہوریت کو مطابق اسلام قرار دیتے ہیں نہ وہ جانتے ہیں کہ جمہوریت کا مفہوم کیا ہے اور نہ ہی وہ جو اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ قرآن کریم کی رو سے مملکت نہ کسی ایک شخص کی ملکیت ہو سکتی ہے، نہ کسی گروہ کی۔ وہ پوری کی پوری اُمّت کو عطا ہوتی ہے۔ آیۂ استخلاف میں ہے۔ وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ ...... (۲۴/۵۵) جو لوگ تم میں سے ایمان اور اعمالِ صالحہ پر کاربند ہوں گے ان سے خدا نے وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ انہیں ملک میں حکومت عطا کرے گا۔ سورۂ حج میں انہی مومنین کے متعلق ہے کہ اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ (۲۲/۴۱) یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں اقتدار حاصل ہو گا تو ...... اس سے واضح ہے کہ مملکت اور حکومت پوری کی پوری اُمّت کو عطا ہوتی ہے۔ یہ رہی ایک بات۔ اور دوسری بات یہ کہ مملکت یا حکومت مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ آیۂ استخلاف میں ہے۔ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَہُمۡ دِیۡنَہُمُ الَّذِی ارۡتَضٰی لَہُمۡ (۲۴/۵۵) یہ اس لئے دی جاتی ہے کہ وہ دینِ خداوندی کو متمکن کریں۔ اور سورۂ حج میں کہا گیا ہے کہ یہ اقتدار اس لئے دیا جاتا ہے کہ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ نَہَوۡا عَنِ الۡمُنۡکَرِ (۲۲/۴۱) وہ اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کریں۔ بالفاظِ دیگر، مملکت کا نظم و نسق پوری اُمّت کا فریضہ ہوگا جسے وہ باہمی مشاورت سے سرانجام دیں گے لیکن اس کا مقصد دین کا تمکن ہوگا، جو کتاب اللہ کی حکمرانی سے حاصل ہو سکے گا۔

(۷)

چونکہ یہ موضوع ذرا پیچیدہ سا ہے اور بحث قدرے طویل ہو گئی ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ملخص چند الفاظ میں بیان کر دیا جائے۔

(۱) دانشورانِ مغرب نے شخصی حکومتوں اور تھیاکریسی سے تنگ آ کر ایک نئے نظامِ حکومت کی طرح ڈالی جسے ڈیماکریسی یا جمہوریت کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(۲) اس نظام کی رُو سے انہوں نے کہا کہ (i) اقتدارِ اعلیٰ قوم کو حاصل ہوتا ہے۔ (ii) قوم اپنے اس اقتدار کو اپنے منتخب نمائندوں کو تفویض کر دیتی ہے۔ اور (iii) یہ نمائندے بالاتفاق یا اکثریت رائے سے جس قسم کا قانون چاہیں وضع کر سکتے ہیں۔ انہیں قانون سازی کا حق مطلق حاصل ہوتا ہے اور ان قوانین کی اطاعت تمام قوم پر لازم۔

(۳) مفکرینِ مغرب نے سمجھا تھا کہ اس سے وہ انسانوں کی حکومت سے نجات حاصل کر لیں گے لیکن تھوڑے سے عرصہ کے تجربہ نے ان پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ یہ نظام، شخصی حکومتوں سے بھی زیادہ مستبد اور انسانیت کش ہے۔

(۴) اس بنا پر اب وہ کسی اور نظام کی تلاش میں ہیں۔ اس نظام کا ان کے ذہن میں تصور یہ ہے کہ

(ا) اس میں حکمرانی انسانوں کے بجائے خدا کی ہونی چاہیئے۔

(ب) اس سے مراد تھیاکریسی نہیں، بلکہ خدا کے عطا کردہ ابدی، غیر متبدل، عالمگیر قوانین سے ہے جن کا اطلاق تمام اقوامِ عالم پر، ہر زمانے میں یکساں ہو سکے۔

(ج) یہ قوانین توحیث غیر متبدل رہیں گے لیکن ان پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق زمانے کے تقاضوں کے ساتھ بدلتے جائیں گے۔ اس مقصد کے لئے حکومت کی مشینری کی ضرورت پڑے گی۔

(د) یہ قوانین، حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی وساطت سے بذریعہ وحی مل سکتے ہیں۔

(۵) اس نظام کے بنیادی اصول تو انہوں نے ذہن میں قائم کر لئے لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آتا... کہ یہ قوانین انہیں ملیں گے کہاں سے؟ وہ (کم و بیش) سب کے سب عیسائیت کے پیرو ہیں لیکن انہوں نے عیسائیت کو اس مقصد کے لئے بالکل ناکام پایا۔

ظاہر ہے کہ ان کے معیار کے مطابق قوانین قرآنِ کریم میں مل سکیں گے لیکن ان کی نگاہ اس طرف سے اس لئے نہیں اٹھ رہی کہ ان کے نزدیک اس قرآن کی حامل قوم مسلمانوں کی ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ پست اور کمزور ہے۔ اور ان کے ہاں یا تو شخصی حکومتیں قائم ہیں یا اس جمہوری انداز کی جسے وہ عملی تجربہ کے بعد مردود قرار دے چکے ہیں۔ اس لئے ان کے اور قرآن کے درمیان یہ حائل ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے ان دانشوروں کی متجسس نگاہوں سے اندازہ لگا لیا تھا کہ دنیا کو کس نظام کی تلاش ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ مسلمانوں کی کسی مملکت میں بھی انہیں اس نظام کی جھلک دکھائی نہیں دے گی۔ اس نظام کو کسی نئے خطۂ زمین میں قائم کر کے، دنیا کو دعوت دینی چاہیئے کہ وہ اپنی آنکھوں سے اس نظام کا مشاہدہ کر لیں۔ اس کے لئے انہوں نے کہا تھا کہ

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد　　　میری نگاہ نہیں سوئے بصرہ و بغداد

اس قسم کی تازہ بستی آباد کرنے کے لئے انہوں نے پاکستان کا تصور دیا تھا۔ ان کا مقصد اس میں قرآنی نظام کا قیام تھا۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ اس دعوت کی سخت مخالفت ہوگی اس لئے اسے قائم کرنے کے لئے بڑی جرأت کی ضرورت ہوگی۔ اسے وہی قائم کر سکے گا جو عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے گا۔

وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہؐ کی حیاتِ ارضی کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ ــــ حسبنا کتاب اللہ ــــ ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔　(خطباتِ اقبالؒ)

پاکستان میں نظامِ حکومت کے متعلق یہی تصور قائدِ اعظمؒ کے ذہن میں تھا۔ انہوں نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ۔

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ مجید کے اصول ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔ (حیدر آباد دکن کا انٹرویو)

پاکستان میں اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کا یہ خواب ہنوز شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا ــــ لیکن اس میں مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ اس نظام نے بالآخر قائم ہو کر رہنا ہے۔ اس کا قیام جس کسی کے بھی مقدر میں ہو، اسے اس کے لئے نیا نام رکھنا ہوگا۔ وہ نہ ملوکیت ہوگی نہ آمریت۔ نہ تھیاکریسی ہوگی نہ ڈیماکریسی۔ چونکہ اس میں حکمرانی کتاب اللہ کی ہوگی، اس لئے وہ اپنے مفہوم اور مقصود کے اعتبار سے (QURAN-O-CRACY) ہوگی ــــ یعنی مملکتِ قرآنیہ۔ اس خطرہ کے پیشِ نظر کہ اس پر شخصی تسلط نہ ہو سکے، اسے "مملکتِ قرآنیہ" کہا جا سکے گا۔ یعنی وہ مملکت جس کا نظم و نسق امّت کے ذمہ ہو لیکن جس پہ حکمرانی یا اقتدارِ اعلیٰ کتاب اللہ (قرآنِ مجید) کا ہو۔ یہی وہ نظام ہے جس کی دنیا کو تلاش ہے۔ اسے اسلامی نہیں کہا جائے گا کیونکہ اگرچہ یہ درحقیقت اسلامی ہوگی لیکن ہمارے مذہبی فرقوں کے اختلافات کی وجہ سے "اسلام" کا کوئی متفق علیہ متعین مفہوم ہی نہیں رہا۔ ہر فرقہ (بلکہ اب تو ہر شخص) کا اسلام کا تصور الگ الگ ہے۔ قرآن کوئی نظریہ یا تصور نہیں۔ وہ ایک محسوس اور مرئی کتاب ہے جس کے منزل من اللہ ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔ اس لئے اس مملکت کو اسلامی کے بجائے قرآنی کہنا ہوگا۔ خود خدا نے بھی: مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴) کہا ہے۔ بالفاظِ دیگر اسلام وہ الدین (نظامِ حیات) ہے جس میں حکمرانی کتاب اللہ کی ہے۔ اس سے مفہوم متعین ہو جاتا ہے۔

(نوشتہ ۱۹۸۱ء)